ایک طالب علم کی کہانی

عبدالغفار مدھولی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

ایک طالب علم کی کہانی

ایک طالب علم کی کہانی

عبدالغفار مدھولی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی

Ek Talib-e-Ilm Ki Kahani
by
Abdul Ghaffar Madholi
Rs.54/-

صدر دفتر
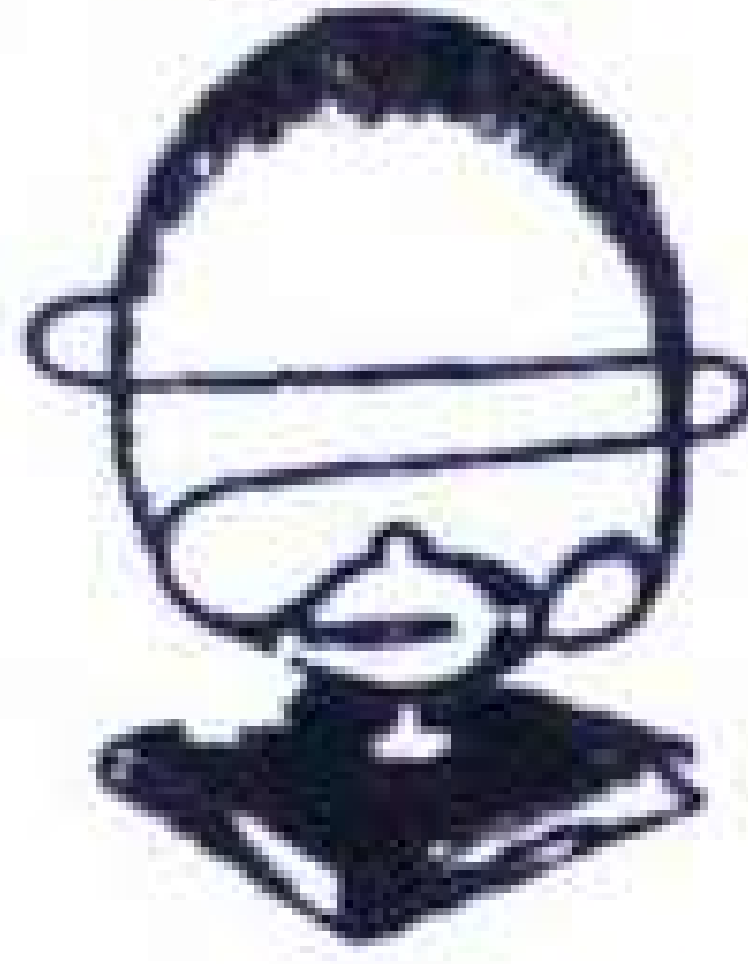
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295

Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔110006 ☎ 011-23260668

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔400003 ☎ 022-23774857

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔202002 ☎ 0571-2706142

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سنہ اشاعت: 2011 تعداد: 1100 قیمت: -/54 روپے

ISBN: 978-81-7587-662-0 سلسلۂ مطبوعات: 1545

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

فون نمبر: 49539000 فیکس: 49539099

ای میل: urducouncil@gmail.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس آفسیٹ پرنٹرز، C-7/5، لارنس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔110035

اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

معروضات

قارئین کرام! آپ جانتے ہیں کہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جو اپنے ماضی کی شاندار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ ۱۹۲۲ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سرد و گرم سے گزرتا ہوا آگے کی جانب گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں، نامساعد حالات سے بھی سابقہ پڑا مگر سفر جاری رہا اور اشاعتوں کا سلسلہ کلی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

اس ادارے نے اردو زبان و ادب کے معتبر و مستند مصنفین کی سیکڑوں کتابیں شائع کی ہیں۔ بچوں کے لیے کم قیمت کتابوں کی اشاعت اور طلبا کے لیے ''درسی کتب'' اور ''معیاری سیریز'' کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی تیاری بھی اس ادارے کے مفید اور مقبول منصوبے رہے ہیں۔ ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کمیاب بلکہ نایاب ہوتی جا رہی تھیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اب تمام کتابیں مکتبہ کی دلی، ممبئی اور علی گڑھ شاخوں پر دستیاب ہیں اور آپ کے مطالبہ پر بھی روانہ کی جائیں گی۔

اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور مکتبہ کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیئرمین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر جناب نجیب جنگ (آئی اے ایس) کی خصوصی دلچسپی کا ذکر ناگزیر ہے۔ موصوف نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے فعال ڈائرکٹر جناب حمید اللہ بھٹ کے ساتھ (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے درمیان) ایک معاہدے کے تحت کتابوں کی اشاعت کے معطل شدہ عمل کو نئی زندگی بخشی ہے۔ اس سرگرم عملی اقدام کے لیے مکتبہ جامعہ کی جانب سے میں ان صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ تعاون آئندہ بھی شاملِ حال رہے گا۔

خالد محمود

مینجنگ ڈائرکٹر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

انتساب

اُس رازدار ساتھی کے نام

جس نے مجھے جامعہ پہنچنے میں مدد دی

(رحمٰن خاں صاحب مدرس مدہول)

اس کتاب پر مرکزی حکومت ہند نے
سرکلر نمبر
F-4-62/64 BS6E-3 مورخہ ۵ دسمبر ۱۹۶۴ء
کے مطابق انعام دیا ہے

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
(آتش)

فہرست

تصاویر

بچپن کی دلچسپیاں

میری پیدائش ۱۹۰۵ء عیسوی (مطابق ۱۳۲۳ھ ہجری) کی ہے۔
مجھے بچپن ہی سے کھیل کود، سیر تماشے کا شوق تھا، لیکن اس کے ساتھ
ساتھ پڑھنے لکھنے میں بھی جی لگتا تھا۔ میرے ساتھی کھلنڈرے تھے
ان کے ماں باپ چاہتے تھے کہ وہ بھی میری طرح رہا کریں، جب
کبھی میں اپنے ساتھیوں کے گھر جاتا تو ان کے ماں باپ کہا کرتے
تم اس لڑکے کے ساتھ رہا کرو تو ہمیں اطمینان رہے گا۔ اور تم سے کچھ
پوچھ گچھ کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ
وہ طاقت ور لڑکے جو مجھے تنگ کرتے تھے، اب میری بات ماننے
لگے

یوں تو سبھی طرح کے کھیل تماشے دیکھا کرتا تھا، لیکن سرکس کے
تماشوں کی نقل کا بڑا شوق تھا، شاید اس لیے کہ اس کی نقل آسان

تھی، اور ماں باپ بھی خفا نہیں ہوتے تھے، نرت اور سنگیت کی نقل سے غالبًا میں اور میرے ساتھی بدنام ہو جاتے، نقل کسی بڑے بند احاطے میں اس اہتمام سے ہوتی تھی کہ شاید ہی کسی چیز کی کسر رہ جاتی ہو، کرتب دکھانے والے، طرح طرح کے جانور، مالک، مینجر، پولیس ٹھیکہ لینے والے، تماشہ دیکھنے والے، گاؤں کے افسر، دنگا کرنے والے، صلح کرانے والے، ان سب کا پارٹ میں اور محلّے کے لڑکے مل کر کرتے تھے۔

میرا وطن مدہول ایک غیر معروف (غیر مشہور) مقام ہے۔ لیکن اس زمانے میں وہاں محرم اور ہولی جس طرح منائی جاتی تھی اگر اس کا حال کسی قدر تفصیل سے لکھوں تو الف لیلہ کی کہانی معلوم ہوگی۔

مدہول (آندھرا) چار بڑے محلوں میں تقسیم ہے (۱) محلّہ کوٹ (۲) محلّہ پنجہ شاہ (۳) قاضی پورہ (۴) مفتی پورہ۔ پورے قصبے کی آبادی دس ہزار ہے، ان چاروں محلوں کو ہر کام میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی فکر رہتی تھی۔

ہر ایک محلہ کا ایک رنگ مقرر کر دیا گیا تھا (۱) لال (۲) نیلا (۳) گلابی (۴) ہرا۔ محرّم کے زمانے میں (یا پنچویں سے دسویں تک) ان ہی رنگوں کا مظاہرہ ہوتا تھا اور اسے رنگ نکلنا کہتے تھے، عیدالاضحیٰ

کے دوسرے دن سے راتوں کو تیاری ہونے لگتی تھی، تیاری کرنے والے بچے اور بڑے کسی احاطہ میں جمع ہو جایا کرتے تھے۔ رنگ برنگ کے کاغذ اور بانس سے کوئی چار فٹ اونچے دو درخت (جھاڑ) بناکر بانس کی دو چوکیوں میں لگا دیتے تھے، ایک درخت کا وزن اتنا ہوتا تھا کہ ایک بڑا لڑکا آسانی سے اُٹھا لیتا، دیوالی میں چراغ جلانے کے لیے جس طرح کی قندیلیں بنائی جاتی ہیں ویسی ہی دو قندیلیں بنا کر ان میں اُبھری ہوئی چار آنکھیں لگا دی جاتی تھیں، ان قندیلوں میں آدمی کے قد کے برابر جوہی کے پھول کی لڑیوں کا ایک سرا اوپر ٹانگ کر نیچے ایک اور بڑے سے گھیرے میں دوسرا سرا ٹانگ دیا جاتا تھا، ان کا نام "بیرق" رکھا گیا تھا، گاؤ دم شکل کی ڈھال بنا کر اس کے آس پاس خوبصورت جھالر لگا دی جاتی تھی، بیچ میں محلہ کا نام لکھ دیا جاتا تھا، اسے "آفتاب گیری" کہتے تھے، ان سب چیزوں کو علیحدہ علیحدہ چھڑ میں باندھ دیا جاتا تھا کپڑے کے دو چھوٹے سے جھنڈے بھی بنا لیتے تھے۔ سب سے خوبصورت چیز "ٹنگری" بنائی جاتی تھی، دو فٹ لمبی ایک فٹ اونچی اور اتنی ہی چوڑی۔ اس کے اوپر رنگ برنگ کا بہت ہی قیمتی کام ہوتا تھا، اوپر پھولوں کا چھوٹا سا گل دستہ لگا دیا جاتا، یوں سمجھو کہ بہت ہی خوبصورت مزار کا نمونہ تیار کیا جاتا، دو اچھے ناچنے والوں کو جوگی بنایا جاتا تھا، سر پر رنگین ٹوپی آنکھوں کے گرد سنہری کاغذ

کانوں میں کُنڈل، بدن پر کفنی، پیر میں گھنگرو، ان سب چیزوں کی تیاری
میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا کہ وہی رنگ غالب رہے
جو اس محلے کے لیے مخصوص ہے۔ یعنی کسی چیز کے رنگ کو دیکھنے سے
یہ معلوم ہو جائے کہ یہ فلاں محلّے کا ہے۔ پانچویں کا دن گذرنے کے
بعد رات کو "مانگ باجا" (جس میں بڑی سی ڈفلی، شہنائی سُر دینے
والا باجا شامل ہوتا ہے) تاشا، ہارمونیم، طبلہ، جوگی، قندیلیں، جھاڑ
جھنڈے، آفتاب گیری، ٹنگری، مشعلیں لے کر محلے کے لوگ، کیا
ہندو اور کیا مسلمان، ایک ہی جگہ جمع ہو کر جلوس کی شکل میں نعرے
لگاتے ہوئے نکلتے تھے۔ خیال تو کرو آگے آگے تاشا پھر مانگ باجا
اور پھر رنگ برنگ کی وہ سب چیزیں، جن کا میں نے ذکر کیا ہے، تمام
لڑکوں کے ایک ہی طرح کے کرتے، گھنگھرو والے دو دو جوگی، گانے
والے اور چھوٹے بڑے ہر طرح کے لوگوں کا کثیر مجمع چلا جا رہا ہے،
پھر اس وقت تو بڑا ہی لطف آتا، جب سڑک کے ایک سرے
سے ایک محلّہ کا رنگ آ رہا ہے تو دوسرے سرے سے دوسرے محلّے
کا رنگ، دونوں محلّوں میں وہی چیزیں ہیں فرق صرف رنگ کا ہے
یہ لوگ سڑک کے دونوں کناروں پر اپنے رستے چلے جاتے
ہیں، شہر کے معزز لوگوں کے ہاں ان "رنگوں" کا استقبال ہوتا تھا
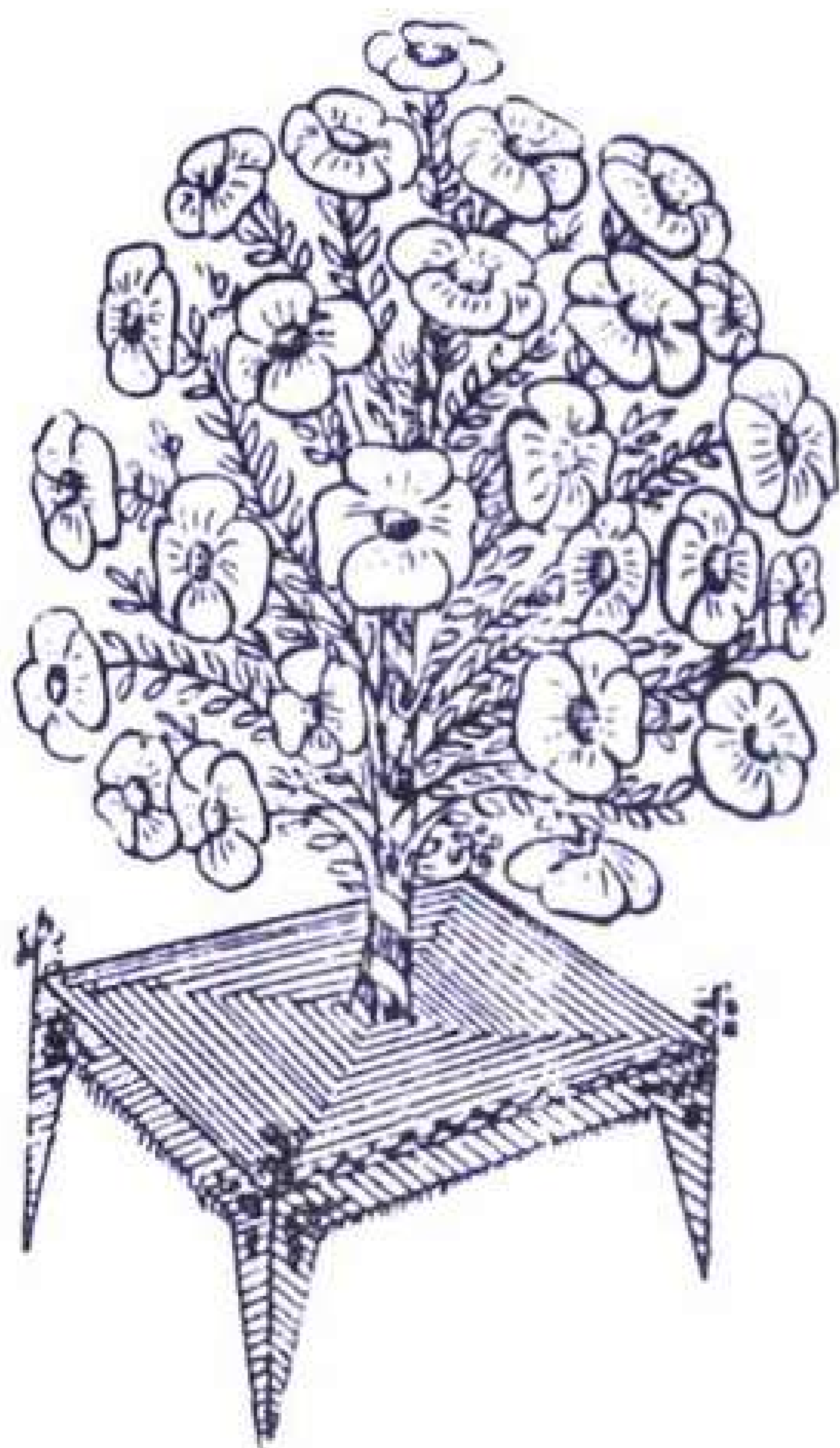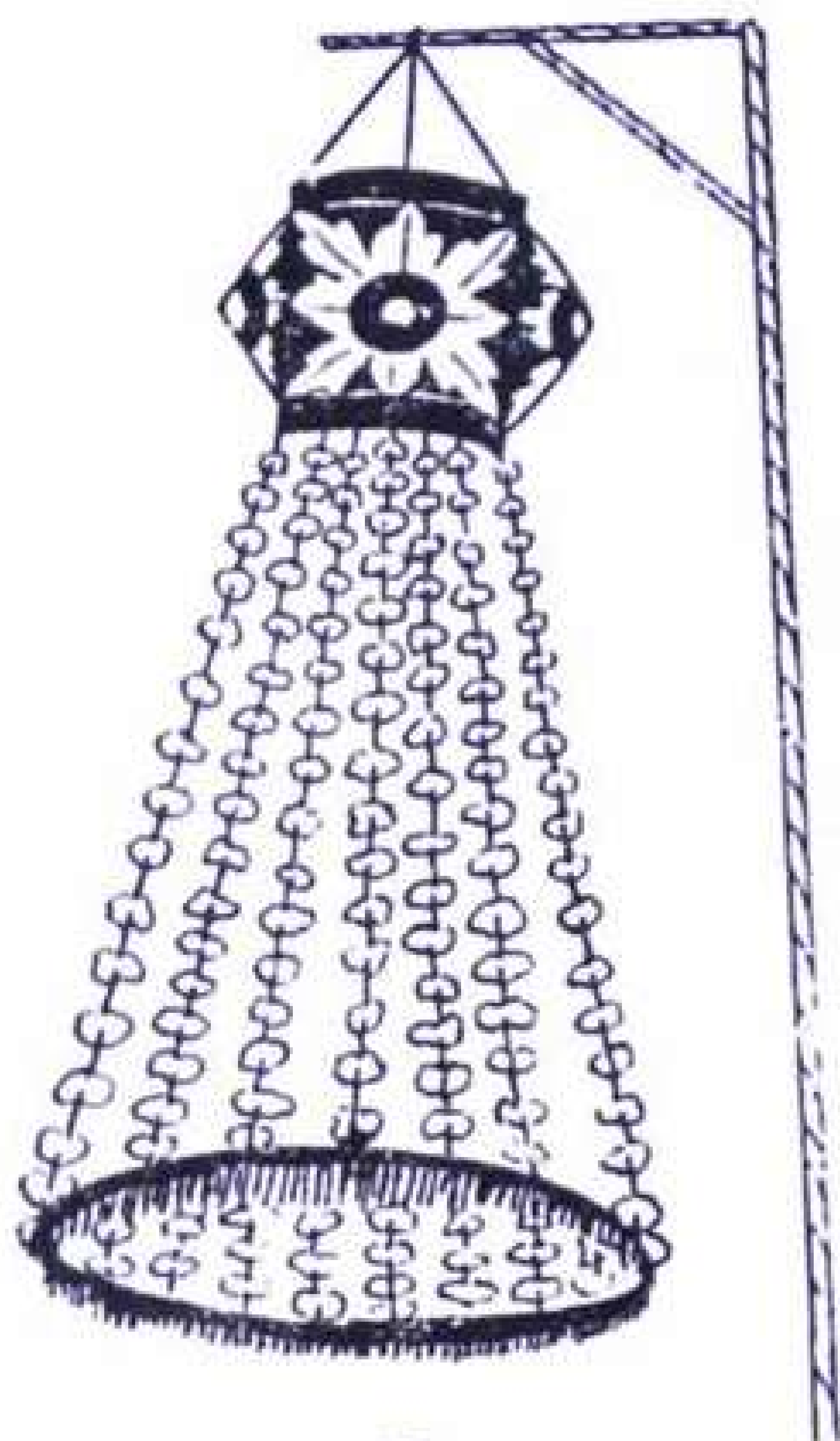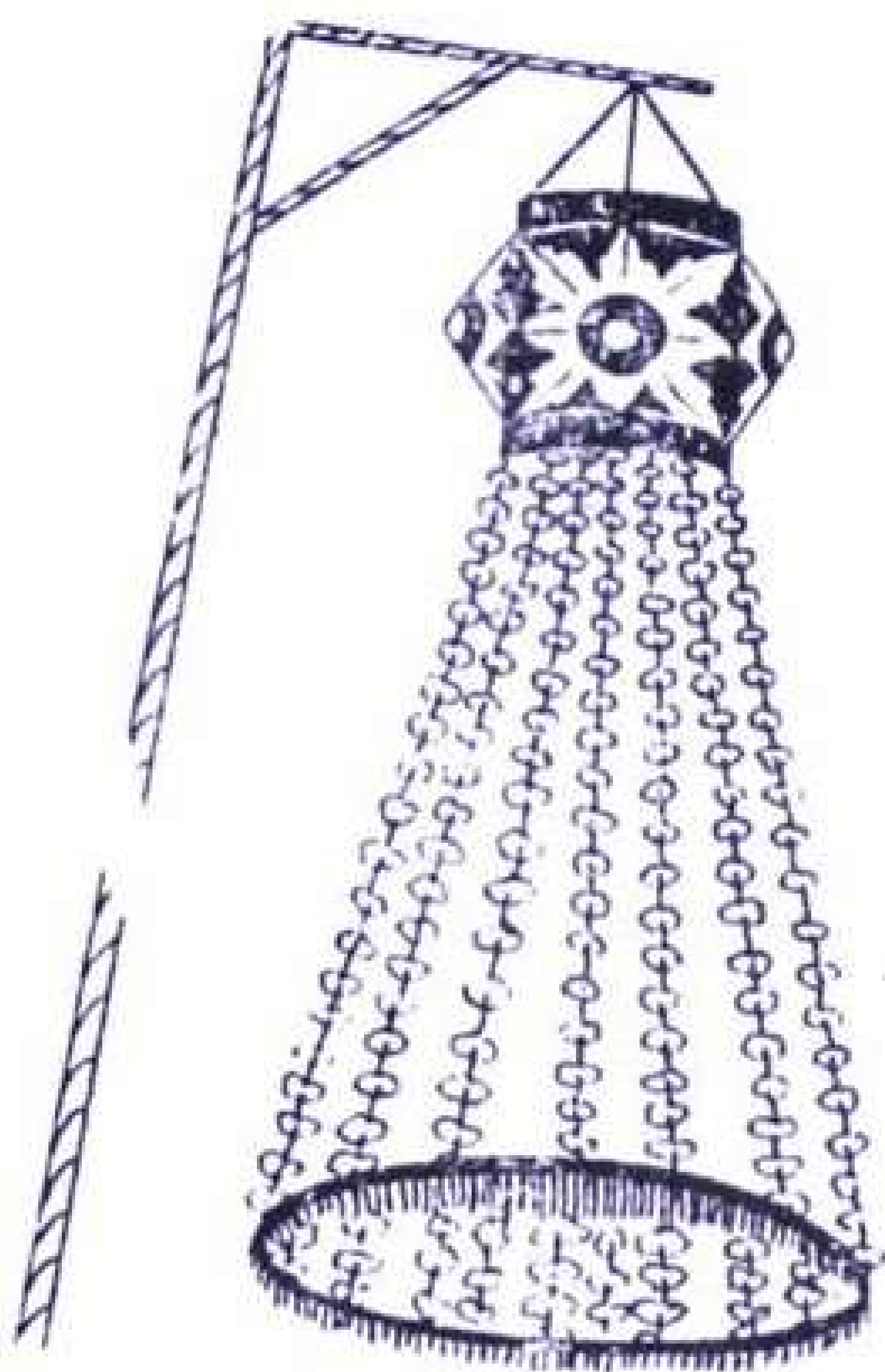
ایک وقت میں ایک محلّے کے لوگ ان کے احاطہ میں جمع ہو جاتے تھے، سامنے فرش پر گھر والے اور ان کے مہمان ہوتے تھے۔ کچھ فاصلے پر یہ رنگ والے بیٹھ جاتے تھے، ہارمونیم، طبلہ کے ساتھ گانے والوں کی ایک جماعت خاص سروں میں سوز پڑھتی تھی، سامنے دونوں جوگی بیر ملا کر ناچتے تھے، ایک میزبان کے ہاں ایک گھنٹہ یہ محفل رہتی تھی، پھر بستی کے دوسرے میزبان کے یہاں جاتے تھے ان میزبانوں میں ہندو مسلمان سبھی اونچے گھرانے ہوتے تھے، میزبان ہندو بھی اسی طرح عقیدت کے ساتھ ان گانوں کو سُنتے تھے جیسے مسلمان، بعض دفعہ ان گانوں میں شہادت کی طویل داستان اس خوبی کے ساتھ بیان کی جاتی تھی کہ تمام لوگوں پر سناٹا چھایا رہتا ـــــ، صرف جوگی کے گھنگھرو، طبلے، ہارمونیم کے سُر اور گانے والوں کی آوازیں سُنائی دیتی تھیں، ہر ایک محلّہ والے یہ کوشش کرتے کہ ہمارا کام دوسروں سے بڑھ کر رہے، نویں کا دن گذرنے کے بعد رات کو آخری جلوس نکلتا تھا، میزبان مناسب رقم چندے کے طور پر دیتے تھے، جس سے رنگ کا خرچ نکل آتا تھا، ہمارے محلے کے اشرف خاں صاحب مرحوم خاص "نئے" میں، جس عمدگی سے شہادت کی داستاں سازوں کے ساتھ بیان کرتے تھے، وہ مجھے ابھی تک یاد ہے۔

آپ طبلہ کے ماہر بھی تھے۔

میں نے بچپن ہی میں ان رنگوں میں خاص حصہ لیا ہے۔ عیدالضحیٰ کا زمانہ آتے ہی، جہاں کہیں بڑوں کو جمع ہوتے دیکھتا، وہیں چپکے سے بیٹھ جاتا، اس خیال سے کہ شاید "رنگوں" کی تیاری کا ذکر ہو، اگر گفتگو میں یہ بات نہ آتی تو اداسی رہتی، لیکن جہاں کہیں ایسی گفتگو سنتا، دوڑتا ہوا ساتھیوں کے پاس جاکر انھیں خوش خبری سُناتا، جوں جوں بڑا ہوتا گیا، ان چیزوں میں عملاً حصہ لیا۔ کئی سال جوگی بنا ہوں، بعض دفعہ بڑے لوگ رنگوں کی تیاری میں پہل کرنے میں دیر لگاتے، اس پر مجھے بڑا غصہ آتا، ان لوگوں سے بحث کرتا کہ وہ دیر کیوں لگا رہے ہیں، وہ میرے ساتھیوں کی شکایت کرتے کہ یہ لوگ کام میں ڈھیل ڈال دیتے ہیں، رنگ نکالیں تو کیسے نکالیں، میں ساتھیوں سے کہتا: "کم بختو! تمہارے ڈھیل ڈالنے سے کام خراب ہو رہا ہے" کہتے ہیں کہ اس سال "رنگ" نہیں نکلے گا۔" اس سے ساتھیوں میں کھلبلی مچ جاتی اور وعدے ہوتے کہ ہماری طرف سے کوتاہی نہ ہوگی۔ جب میری عمر سولہ سترہ سال کی ہوئی تو بڑوں کی خوشامد کرنے کی بجائے مجھے یہی اچھا معلوم ہوا کہ اس کام کی پوری ذمہ داری اپنے سر لوں، میں اپنے ساتھیوں سے

کام لینا جانتا تھا، اپنے ہم عمروں کو اس بات پر آمادہ کر لیتا کہ ہم خود اس کام کو چلائیں گے، ان سے کام لینے میں اچھی خاصی دردسری کرنی پڑتی تھی، ایک ہی وقت میں کئی ٹولیاں پھول پتیاں بنانے، گتے کاٹنے، پھول پتیوں کو جوڑنے، لڑیوں میں پرونے کا کام کرتی تھیں، ایک طرف سازوں کے ساتھ گانے کی مشق ہوتی تھی، لڑکے جس کام کو زیادہ دلچسپ پاتے، اُدھر چلے جاتے۔ اگر ان لوگوں کی فکر نہ کی جائے تو ایک کام ٹھیک سے ہو جاتا تھا مگر دوسرے کام رہ جاتے تھے، اس لیے لڑکوں کو ایک جگہ سے اُٹھا کر دوسری جگہ بٹھانا پڑتا تھا، بعض دفعہ ساتھی کہتے: "بھائی دو ایک گانے سُن لینے دو، پھر پہلے سے زیادہ کام کریں گے"۔ کبھی تو میں خوشی سے اجازت دے دیتا، کبھی غصے ہو کر منہ پھلائے ایک طرف بیٹھ جاتا، اس پر لڑکے یہ کہتے ہوئے اپنی ٹولیوں میں چلے جاتے " اچھا بھائی خفا نہ ہو، جتنی دیر گانا سُنتے رہے، اس کی کمی تھوڑی سی دیر میں پوری کیے دیتے ہیں

جلوس نکلنے کے دن تو میری عجیب و غریب حالت رہتی۔ سمجھانا، خوشامد، ڈانٹ ڈپٹ، غصّہ غرض جیسا موقع ہوتا ویسا ہی کرنا پڑتا اگر کوئی شخص کام کرنے پر تیار نہ ہوتا تو میں ہمت نہ ہارتا تھا، بلکہ

وہ کام کسی اور کے سپرد کر دیتا تھا، اس سے پہلا شخص بہت شرمندہ ہوتا اور میرے پیچھے پیچھے لگا رہتا، شاید اس کے لیے کوئی کام نکل آئے، ہماری یہ مستعدی دیکھ کر بڑے لوگ خود ہی ہمارا ہاتھ بٹانے لگتے۔ البتہ اشرف خاں صاحب مرحوم کی بہت خوشامد کرنی پڑتی تھی، کیونکہ اُن سے اچھا گانے والا کوئی ملتا نہ تھا۔ یہ لڑکوں کو سکھاتے بھی بہت اچھا تھے، اچھی آواز والے کئی لڑکوں نے ان سے گانا بجانا سیکھا ہے، ان میں میرے ایک شاگرد امیر خاں صاحب بھی ہیں، اشرف خاں صاحب میرے متعلق کہتے تھے کہ آواز بُری نہیں ہے، گانے کا شوق ہے، اس لیے سیکھنے والوں میں شریک کیے لیتا ہوں۔ ہمارے محلہ کا نام "محلہ کوٹ" ہے، اور نشانی سُرخ رنگ ہے، رات کی روشنی میں یہ رنگ صاف نظر آجایا کرتا تھا

اُس زمانے میں دُوسرے محلّے کے لوگ ڈراما بھی دکھایا کرتے تھے، میں نے بھی اپنے ساتھیوں میں اس کی کوشش کی مگر ہمارا محلہ پٹھانوں کا ہے، لوگوں نے سمجھایا کہ لڑکوں کو لڑکیاں بنانے سے کیا فائدہ؟ اس طرح دُوسرے محلوں میں ناچنے والے جوگی کے ساتھ جوگن بھی ہوا کرتی تھی، مگر ہمارے محلہ میں یہ دستور چلا آتا تھا

کہ دونوں ناچنے والے "جوگی" ہی ہوتے تھے۔ لوگ کہتے تھے آخر ہمارے بزرگوں نے کچھ سوچ کر ہی جوگن کا رواج نہیں رکھا ہے ہم بچے بھی بڑوں کی تائید میں دلیلیں دیا کرتے تھے۔

ہولی سے کوئی بارہ دن پہلے پھاگن کی چاندنی راتوں میں محلے کے لوگ "گھونسہ بازی" کی مشق کے لیے میدان میں جمع ہو جایا کرتے تھے، دو فریق بنا کر درمیان میں رہنا تھام لیا جاتا تھا، اسے "پیڑی" کہتے تھے، بڑے بزرگ "چُٹّے (دیہاتی سگار) سُلگا کر ٹولیوں میں بیٹھ جاتے اور کہتے: "ارے بھائی! ابھی تو پہلی راتیں ہیں ہم لوگ سیکھے سکھائے ہیں۔ مشق تو تم جیسے چھوکروں کو کرنی چاہیے جاؤ کھیلو، ہم یہاں سے دیکھ رہے ہیں، پھر یہ لوگ اپنے بچپن کے قصے دُہرانے میں مصروف ہو جاتے۔ ان میں سے چند آدمی ہمیں سکھانے کے لیے آجاتے، کھیلنے والے رستے کے قریب صف در صف آمنے سامنے اس طرح کھڑے ہو جاتے کہ سب سے کم عمر یعنی دس بارہ سال کے لڑکے آگے آگے، پھر بڑوں کی قطاریں (یہ بھی عمر کے لحاظ سے) پیچھے کھڑی ہو جاتیں، صرف چہرے پر اور پیٹ پر گھونسے مارنے کی اجازت نہ تھی اور سارے بدن پر جہاں چاہے مار سکتے تھے، اس بات کی پابندی بھی تھی کہ اپنے

سے چھوٹی عمر والے پر ہاتھ نہ اُٹھائیں، ان پابندیوں پر پورا عمل ہوتا تھا، اس لیے چھوٹے بڑے بے دھڑک "پیڑی" کے قریب جمع ہو جاتے تھے۔ کھلانے والا کہتا، فلاں شخص ابتدا کرے بس حکم ملتے ہی ہاتھ پر ہاتھ مار کر پہلے ایک شخص گھونسے مارتا پھر دوسرا، تیسرا، چوتھا، ذرا سی دیر میں دنادن کی آوازیں شروع ہو جاتیں کھیلنے والوں کو پچھلی قطار والے شور مچا کر ہمت دلاتے، جب لڑکے تھک جاتے تو خود ہی پیچھے ہٹنے لگتے، ان کی جگہ پیچھے کی صف والے کود پڑتے، یہاں تک تمام بڑے لوگ اس گھونسہ بازی میں مشغول ہو جاتے۔

کھیل میں ہار جیت کا فیصلہ اس طرح ہوتا تھا کہ وہ "پیڑی" جسے لوگ تھامے رہتے۔ ایک فریق کے زور پکڑنے سے پیچھے ہٹتی جاتے یہاں تک کہ دوسرا فریق اسے سنبھال نہ سکے تو کھلانے والے لوگ جو درمیان میں موجود ہوتے تھے، اپنے اپنے رومال اونچے کر دیتے، اور آواز لگاتے تھے کہ "اب ہاتھ روک لو" رفتہ رفتہ گھونسوں کی آوازیں کم ہوتی جاتی تھیں، جب اس کھیل سے جی بھر جاتا تو سب لوگ چاندنی راتوں میں کوئی بارہ ایک بجے کے قریب اپنے گھروں کو لوٹتے تھے یہ سلسلہ بارہ راتوں تک

جاری رہتا اور ہر محلہ اپنی جگہ مشق کرتا۔ دھولنڈی کے دن سہ پہر میں بہت بڑے میدان میں پوری بستی کا آخری مقابلہ ہوتا تھا، دو محلے ایک طرف اور دو محلے ایک طرف ہوتے تھے، فریقوں کی تقسیم محلے کے حساب سے ہوتی تھی۔ تحصیلدار، امین (انسپکٹر) ڈاکٹر، دوسرے عہدے دار، وکیل، مدرس، بستی کے اور پڑھے لکھے لوگ ایک اونچے مقام پر بیٹھ جاتے، اس دن چھوٹے لڑکوں کو کھیلنے کی اجازت نہیں ملتی تھی، صرف بڑے اپنے جوہر دکھاتے، منظر وہی ہوتا جو میں بیان کر چکا ہوں، فرق اتنا ہے کہ اب بڑے معرکے کا رن پڑتا، جو لوگ زخمی ہوتے، گھروں یا ہسپتالوں میں پہنچا دیئے جاتے، چھوٹے لڑکے بہت خوش خوش آوازیں لگاتے کہ "اور پڑے" "اور پڑے" شام کو کشتی کے مقابلے ہوتے۔

ایک دفعہ میرے ایک بھائی صاحب "گھونسہ بازی" میں بُری طرح پٹ کر گھر لوٹے۔ والدہ صاحبہ نے مرہم پٹی تو کر دی، لیکن رواج سے مجبور تھیں کہ ایسے موقع پر ہمدردی کا اظہار نہ کیا جائے۔

گھونسہ بازی میں مَیں نے بھی حصّہ لیا ہے، لیکن عمر زیادہ ہوگئی تو خود کھیلنا چھوڑ دیا، کیونکہ میرے ساتھی بہت طاقت ور ہو گئے تھے، پھر بھی کھیل سے میری دلچسپی کم نہیں ہوئی، بلکہ لوگوں کو اُکسانے

اور کھیل جمانے میں پہلے سے زیادہ حصّہ لیتا تھا۔

۱۹۲۳ء میں ریاست نے محرم اور ہولی کے ان کھیلوں کو لہو و لعب قرار دے کر ان کو ممنوع قرار دے دیا، بس ایک کشتی کی اجازت رہ گئی۔

مدہول کی "بھانامتی" (جادو کی ایک قسم) بھی بہت مشہور ہے مگر اب اس کا زور کم ہو گیا ہے، انجمن ترقی اُردو کے سکریٹری مولوی عبدالحق صاحب اس زمانے میں ہمارے علاقے کے صدر مہتمم تعلیمات (انسپکٹر مدارس) تھے، ان کے علم میں اس طرح کے کئی عجیب و غریب واقعات تھے جو بھانامتی سے منسوب کیے جاتے تھے، جب کبھی ان سے ملاقات کا موقع ملتا تو بھانامتی اور گھونے بازی کا ذکر چھیڑ دیتے۔

میں بچپن ہی سے محنت و مشقت کی زندگی بسر کرتا تھا، اور طرح طرح کے کاموں میں مصروف رہتا تھا۔ اس کا میری زندگی پر بہت اثر پڑا

میرے ماموں ہر سال گیارہویں شریف کی تقریب میں محفلِ میلاد شریف کیا کرتے تھے، مجھے اس دن کا بے چینی سے انتظار رہتا تھا، کیونکہ رات بھر جاگ کر جشن منانے کا موقع ملتا تھا، یہ شوق اتنا بڑھا کہ میں نے میلاد خوانوں کی جماعت میں باقاعدہ شرکت کر لی۔

ہمارے یہاں "میلاد خوانی" میں قصیدے اور نظمیں ایک

مخصوص پیشہ ور جماعت بُلند آواز سے پڑھتی ہے، اس طرح کہ جماعت کا سردار جسے "بادی" کہتے ہیں اور جو خُوش گلو بھی ہوتا ہے ایک شعر پڑھتا ہے، اس کے ساتھی جن کی تعداد پانچ سے دس تک ہوتی ہے، جنہیں "رنّادی" کہتے ہیں، شعر کو اسی طرح دہراتے ہیں، یہ سلسلہ رات کو دس بجے سے صبح تک جاری رہتا ہے، مہمان (عورتیں اور مرد) جمع ہوتے ہیں، چائے کا دور چلتا ہے، جوں جوں رات گذرتی جاتی ہے، پُرانے قصّے نظم میں سُنائے جاتے ہیں، عورتیں عام طور پر "حلیمہ دائیؓ" اور "حضرت مسلمؓ" کے بچّوں کی شہادت کا واقعہ، حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی کرامات کے قصّے سُنانے کی فرمائش کرتی ہیں، نئے نئے قصیدے بھی سُنائے جاتے ہیں، گیارہویں شریف کے موقع پر میلاد خوانی کا زور رہتا ہے۔ میں نے بھی کئی سال "ردآدی" کی حیثیت سے کام کیا ہے

ہمارے ہاں ایک اور رواج تھا جو اب کم ہوگیا ہے، کچھ تو نئے مشغلوں کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ اب اسے مذہبی اہمیت نہیں دی جاتی، رمضان کے آخری عشرے کی راتوں میں سے کسی ایک طاق رات کو فاتحہ خوانی کی تقریب اس اہتمام کے ساتھ منائی جاتی تھی کہ محلے کے لوگوں سے چندہ جمع کرکے سحری

کے لیے کھانا پکانے کا انتظام، مسجدوں میں جھاڑ اور فانوس کا جگمگانا، تراویح میں ہر چار رکعت کے بعد میلاد خوانی، غرض اس تقریب میں سارے محلے کے لوگ حصہ لیتے تھے، پھر سب ایک جگہ سحری کھا کر صبح کی نماز کے بعد اپنے گھروں کو لوٹتے تھے، اس تقریب میں کسی ایک چیز کی بھی کمی رہ جائے تو مجھے افسوس ہوتا تھا، جس طرح بعض لوگ عید ہی کے بہانے سے نماز پڑھ لیتے ہیں، اسی طرح اس رسم کے سلسلے میں عبادت کر لیا کرتے تھے آم کی نئی فصل آنے پر جمعہ کی نماز کے بعد آموں کی تقسیم کا سلسلہ غالباً اب بھی جاری ہے

بستی سے آٹھ میل دور "شوراتری" کا میلا لگتا تھا، بھائی صاحب ناگوراؤ صاحب دیس مکھ کے پاس ملازم تھے، مجھے "دیسائی" ہر سال میلے میں لے جاتے تھے، بھائی صاحب ایسے خود دار کہ مجھے صرف اس صورت میں بلاتے جب دیسائی یاد دلائیں، ایک دو دفعہ انھیں خیال نہ رہا، میرا میلا ناغہ ہوگیا، میں نے بھی یہ ترکیب سوچی کہ میلے سے کئی دن پہلے خود ہی ان کے پاس پہنچ جاتا، اس پر بھائی صاحب بہت خفا ہوتے تھے، ایک دفعہ انھوں نے مجھے بہت ڈانٹا، یہ بات دیسائی کو معلوم ہوئی، وہ بھائی صاحب پر خفا ہوئے کہ بچے کو میلے کا شوق ہے تو اس میں کیا ہرج ہے، پھر تو میرے لیے کوئی روک ٹوک نہ رہی

ان سب تقریبوں اور کھیل تماشوں میں، میری نیت ہمیشہ یہ ہوتی تھی کہ ہنگامہ ہو۔ مگر خیر خوبی سے ہو۔ کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے، جس سے آئندہ کے لیے رکاوٹ پیدا ہو

ابتدائی تعلیم

پہلی جماعت میں میرا داخلہ خاصی بڑی عمر میں یعنی آٹھ سال کی عمر میں ہوا تھا۔ چوتھی جماعت میں پہونچنے سے پہلے میں نے اس کی کسر یوں پوری کی کہ ایک سال میں دو جماعتوں کا امتحان پاس کر لیا۔

پڑھائی پرانے طریقے سے ہوتی تھی، آجکل کی طرح ہمارے مدرسے میں دُکان، بینک، خونچہ، چڑیا گھر، باغبانی، حرفہ کا کام، بچوں کی مجلس یا حکومت ہوتی تو شاید مجھے کئی چیزوں میں اپنی کارگذاری دکھانے کا موقع ملتا، لوگوں سے سُنا تھا کہ حیدرآباد میں بچے اقامت گاہوں میں رہتے ہیں، پڑھائی مدرسے میں ہوتی ہے۔ لیکن اس کے لیے تیاری اور سبق یاد کرنے کا کام اقامت گاہ میں کیا جاتا ہے۔ میں نے اپنے چند ساتھیوں کو اس پر آمادہ کیا کہ ہم لوگ روزانہ رات کو کسی اُستاد کے ہاں جاکر وہیں لکھنے پڑھنے کی تیاری کریں اور ممکن ہو تو وہیں سو جایا کریں، لیکن یہ بات اس وقت کی ہے، جب میں نے پانچویں جماعت کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ اس سے پہلے کسی اُستاد کے یہاں جاکر تھوڑے وقت اُن کے

گھر کا کام کاج کرتا اور اُن سے پڑھائی میں مدد لیتا، کوئی سیانا ساتھی مجھ سے کہتا کہ تم فلاں اُستاد کے یہاں جاکر پانی بھرتے ہو، صفائی کرتے ہو، کیا تم ان کے نوکر ہو؟ کوئی اور ساتھی اسے ٹوک دیتا کہ تم کیا جانو، استاد کی خدمت کتنی بڑی چیز ہے۔

سہ پہر میں چھٹی سے پہلے ایک پیریڈ ایسا بھی ہوتا تھا کہ جماعت کے سب لڑکے ایک صف میں کھڑے ہو جاتے، استاد ایک سرے سے ان سے کتواں پہاڑے پوچھتا، اگر وہ لڑکے جو صف کے شروع میں کھڑے ہوتے تھے نہ بتا سکتے اور وہ لڑکا جس کا نمبر ان کے بعد آتا صحیح بتا دیتا تو اسے حکم دیا جاتا کہ نہ بتلانے والوں کو ایک ایک چانٹا لگا کر ان سے اُوپر ہو جاتے، مجھے دُوسروں کو سزا دینے یا خود سزا پانے دونوں ہی سے کوفت ہوتی تھی، اس لئے یہ پیریڈ میرے لیے بڑا تکلیف دہ تھا۔

ہر جمعرات کو "آموختہ" ہوتا تھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہفتہ بھر میں جو کچھ پڑھا ہے، اسے دُہرائیں، اس دن ہم ایسا محسوس کرتے تھے کہ ہمیں آزادی ہے، جو جی چاہیں پڑھیں، جس طرح چاہیں پڑھیں، ہم اپنے پچھلے سبق شوق سے دُہراتے تھے اور ساتھیوں کو سُنا کر ان سے داد حاصل کرتے تھے۔

بھائی صاحب میری پڑھائی کا بہت خیال رکھتے تھے، اس زمانے کے رواج کے مطابق وہی لڑکا پڑھنے لکھنے میں ہوشیار سمجھا جاتا تھا جو ٹیڑھے سے ٹیڑھا (شکستہ) خط آسانی سے پڑھ لے۔ شکستہ خطوں کی چھپی ہوئی کتاب بھائی صاحب کے ہاتھ لگ گئی تھی، اس کتاب نے مجھے بہت دنوں تک پریشان کیا، بھائی صاحب مغرب کے بعد اپنے کام سے واپس آتے، کھانا کھانے کے بعد شکستہ خطوں کی یہ کتاب مجھے دے کر چراغ کے پاس بٹھا دیتے اور کہتے کہ "زور" پڑھ کر سناؤ۔ میں شاید چوتھی جماعت میں تھا، شکستہ خط، چراغ کی مدھم روشنی میں پڑھنے میں قدم قدم پر اٹکتا، اس پر والدہ سے کہتے "دیکھئے آپ کے لاڈ پیار سے یہ خراب ہو رہا ہے، سارا دن ناٹک، تماشوں کی نقل میں لگا رہتا ہے، مگر دو سطریں ٹھیک سے پڑھی نہیں جاتیں۔" والدہ کہتیں: "محی الدین بی (رشتہ کی ایک بہن) سے پوچھ رات کے دس گیارہ بجے تک پڑھتا ہے، پڑھتے پڑھتے دُبلا ہو گیا ہے، نہ جانے کون سی کتاب اُٹھا لایا ہے، خواہ مخواہ میرے بچے کو پریشان کرتا ہے۔" بھائی صاحب جواب میں کہتے۔۔ "آپ کی انھیں باتوں نے اسے بگاڑا ہے۔" والدہ مجھ سے ہمیشہ کہا کرتیں: "زیادہ خیال اپنی تندرستی کا رکھ۔ پڑھنا، لکھنا

سب آجائے گا۔" میں اپنے سر سے الزام دور کرنے کے لیے بھائی صاحب کے سامنے چھپی ہوئی مشکل سے مشکل کتاب روانی کے ساتھ فر فر پڑھ کر سنا دیتا، لیکن بھائی صاحب کہتے: یہ سب بیکار ہے، صاف خط میں چھپی ہوئی کتاب پڑھنا کیا مشکل ہے، بات تو جب ہے کہ خط شکست میں ہاتھ سے لکھی ہوئی عبارت پڑھ سکو۔

فٹ بال میچ کھیلنے کے لیے ہم آس پاس کے گاؤں میں جایا کرتے تھے، میں خود تو نہیں کھیلتا تھا، مگر انتظام ضرور کرتا تھا، اس طرح جیسا کہ سرکس کے تماشوں میں — ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جس استاد کے ہاں ہم لوگ رات کو پڑھنے کے لیے جایا کرتے تھے، ان کا تبادلہ ہو گیا۔ دن کو الوداعی دعوت ٹھیری، رات ہی سے انتظام ہو رہے تھے، کچھ لڑکے ہار پھول لینے کے لیے ضلع کے صدر مقام کو گئے ہوئے تھے اور رات کو دو بجے لوٹنے والے تھے۔ ہمارے تعلقے سے اسٹیشن ۹ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس زمانے میں بسوں کا انتظام نہیں تھا، ہم لوگ کام کرتے کرتے تھک گئے تھے، میں نے ساتھیوں سے کہا تفریح رہے گی، دھوبیوں کے گدھے ادھر ادھر پھرتے ہیں، ان پر سوار ہو کر ساتھیوں کے استقبال کے لیے اسٹیشن پر چلیں، چاندنی رات تھی، دس بارہ لڑکوں کی ٹولی

بڑی شان سے گدھوں پر لدی ہوئی اسٹیشن پہونچی، اس میں جو
لُطف آیا، وہ اب تک کسی سفر میں نہیں آیا تھا۔

اس زمانے میں پہلا باقاعدہ امتحان جو محکمۂ تعلیم کی طرف سے
لیا جاتا تھا، پانچویں جماعت کا امتحان تھا، جو امتحان تحتانی
کہلاتا تھا، یہ امتحان دینے کے لیے ضلع کے صدر مقام جانا ہوتا۔
امتحان کے چھپے ہوئے پرچے ملتے تھے، نتیجے کا اعلان اخبارات
کے ذریعہ ہوتا تھا، اس لیے اس امتحان کی ہماری نظر میں بڑی
اہمیت تھی اور سال بھر تک ہمارے ذہن میں اس کی فکر سوار رہتی
تھی، اس کے بعد ساتویں جماعت کا امتحان، مڈل کا امتحان
(امتحان وسطانی) کہلاتا تھا، اس کے لیے ضلع کے "مرکز" میں
جانا پڑتا، اس کی پڑھائی اور بھی زیادہ اہتمام سے ہوتی تھی، درسی
کتابوں، خصوصاً تاریخ، جغرافیہ کے خلاصے ہم لوگ زبانی یاد کرتے
تھے، سوال جواب کی چھپی ہوئی کتابیں بھی تھیں، ساتھی کوئی ایک
سوال پوچھے تو، ہم اس کا جواب جیسا کتاب میں لکھا ہوتا تھا، لفظ
بہ لفظ سنا دیتے تھے، حساب کا معیار بہت بلند تھا۔ چکرورتی کا
"علم الحساب" (جس کے صفحے پانچ سو کے لگ بھگ ہوں گے) بہت
مشہور تھا، اس کی کئی جلدیں ہماری جماعت میں تھیں، مشکل سے

مشکل سوال حل کرنے میں خوشی ہوتی تھی ۔ حساب کے تقریباً تمام ہی قاعدوں کی خوب مشق کرائی جاتی تھی، الجبرا جیومٹری پر خاص توجہ تھی۔ اس زمانے کے حساب کی سوجھ بوجھ اور مشق اب تک کام آ رہی ہے۔ ہر جماعت میں دو زبانیں پڑھائی جاتی تھیں، اُردو اور علاقائی زبان، یہ امتحان پاس کرنے کے بعد نوکری آسانی سے مل جاتی تھی، میں نے مڈل کا امتحان ۱۹۲۰ء میں پاس کر لیا۔

مدہول میں صرف مڈل تک کی پڑھائی کا انتظام تھا، اس سے آگے تعلیم پانے کے لیے ضلع کے صدر مقام یا حیدرآباد جانا پڑتا تھا۔ گھر کی مالی حالت ایسی نہ تھی کہ مدہول سے باہر جاکر تعلیم پاؤں، جب صورت نہ نکلی تو یہی طے کیا کہ مرہٹی زبان دانی کا (مڈل کے معیار کا) امتحان دوں، اس طرح ایک اور سال گذر گیا۔

ہمارے مدرسے کے پہلی جماعت کے ایک استاد لمبے عرصے کی چھٹی پر گئے ہوئے تھے، انجمن اُردو کی پیشہ وروں کی لغت تیار کرنے والے مولوی احمد علی صاحب اس زمانے میں صدر مدرس تھے، میرے مختلف قسم کے تعلیمی اور انتظامی کاموں کو دیکھ کر موصوف نے اندازہ لگایا تھا کہ میں پہلی جماعت کی پڑھائی کے لیے موزوں ثابت ہوں گا انجمن کی طرف سے شائع کردہ قاعدہ (طریق الصوت کے مطابق)

آپ ہی نے تیار کیا تھا، انہوں نے پہلی جماعت کے مدرس کی عوضی خدمت سپرد کی اور اپنے قاعدے کے پڑھانے کا طریقہ بھی سمجھا دیا۔ مجھے نئی نئی چیزوں کے سیکھنے کا شوق شروع سے تھا، مولوی صاحب کے اس نئے قاعدے کی بدولت پڑھانے کے کام سے میری دلچسپی اور بڑھ گئی، میں ہنسی خوشی پہلی جماعت کو پڑھانے لگا، چونکہ میں جسمانی سزا بہت کم دیتا تھا اور سبق کو دلچسپ بنانے کی کوشش کرتا تھا، اس لیے بچے مانوس ہو گئے تھے۔

انجمن ترقی اُردو کے سکریٹری مولوی عبدالحق صاحب اس زمانے میں صدر مہتمم تعلیمات تھے، جب آپ معائنہ کے لیے مدھول آئے تو مجھے وہ قاعدہ پڑھاتے ہوئے دیکھا، ان کی یہ رائے ہوئی کہ مجھے مزید تعلیم پانے کے لیے حیدرآباد کے نارمل اسکول بھیجا جائے، میری یہ خواہش کہ میں اور آگے پڑھوں، پوری ہوئی اور اس شان سے ہوئی کہ میرے تمام اخراجات محکمہ کی طرف سے ادا کئے گئے، میں ۱۹۲۳ء میں حیدرآباد گیا۔

مدھول میں آزادی کی تحریک کا نام سُنا تھا، مگر اس کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہ تھا۔ بھلا ریاست کے ایک غیر معروف قصبے میں ہمیں آزادی کی تحریک کی اہمیت کون سمجھاتا، پھر بھی میرے دل کو

آزادی کے لیے کوشش کرنے والوں سے ایک تعلق تھا، جب میں حیدرآباد
پہونچا تو یہاں اخبارات تھے، آزادی اور غلامی کے چرچے تھے،
میری سیاسی دلچسپی میں اضافہ ہوا۔ اتفاق دیکھئے کہ اُسی زمانے میں
جامعہ کے پرنسپل (شیخ الجامعہ) خواجہ عبدالمجید صاحب اور ان کے ساتھی
حیدرآباد آئے ہوئے تھے، جامعہ کے چرچے ہمارے بورڈنگ ہاؤس
میں ہونے لگے، پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ جامعہ کیا چیز ہے، میں نے سوچا
کہ وہ مدرسہ جس میں پڑھنے پڑھانے کا کام بھی ہو اور اس کے ساتھ
ساتھ ملک کی آزادی کا حوصلہ پورا ہو' میرے مطلب کا ہے، جی چاہتا
تھا کہ کسی طرح جامعہ میں جاکر پڑھوں، کئی مشکلات میرے سامنے تھیں
علی گڑھ جیسا دُور دراز مقام، وظیفہ ملنے کی بہت کم اُمّید' اتنے دام
بھی نہیں تھے کہ آسانی سے وہاں پہونچ جاؤں، بڑی کشمکش میں تھا
مگر دو باتوں نے مجھے نا اُمّید نہ ہونے دیا، ایک تو مزید تعلیم پانے کا
شوق، دوسری آزادی کی تحریک سے دلچسپی، یہی دُھن سر میں سمائی کہ
جو کچھ بھی ہو اب تو جامعہ کی طرف چلنا ہی چاہئیے، میں نے ایک ساتھی
کو یہ راز بتایا اور کہا کہ دیکھئے جب تک میں نہ کہوں کسی پر ظاہر نہ کرنا،
ورنہ سب کھیل بگڑ جائے گا

شمالی ہند کا پہلا سفر

میرے پاس اتنے دام نہ تھے کہ پورے سفر کے لئے کافی ہوتے، کم سے کم منماڑ تک کا ٹکٹ لینا ضروری تھا، اگر ریاست کے اندر گرفتار ہوتا تو گھر لوٹنا پڑتا، چنانچہ پہلا ٹکٹ منماڑ تک کا لیا۔ ایک مشکل یہ بھی تھی کہ راستے میں ہمارا اسٹیشن باسر پڑتا تھا، رات کی گاڑی سے روانہ ہوا، پھر بھی طرح طرح کے خیالات آتے تھے، ایسا نہ ہو گاڑی میں کوئی جان پہچان کا آدمی سوار ہو جائے، باسر اسٹیشن پر جانے والے ملیں گے، وہ پوچھیں گے۔ سب لوگ چھٹیوں میں گھر آتے ہیں، تم سیر کے لیے کہاں جا رہے ہو، پھر اس کی اطلاع گھر پر ہو جائے گی! کیا سفر خیریت سے گذر جائے گا؟ جامعہ والے میری بات سن لیں گے؟ گاڑی زناٹے سے چل رہی تھی، پچھلے واقعات ایک ایک کرکے یاد آرہے تھے، "اگر ماں کو معلوم ہو گیا تو کیا ہوگا؟"۔ گاڑی نے زور سے سیٹی دی میں گھبرایا، کہیں باسر کا اسٹیشن تو نہیں ہے؟ سچ مچ وہی اسٹیشن نکلا، میں جلدی سے بنچ پر لیٹ گیا۔ بس یہی خیال تھا: "اگر ماں کو معلوم ہو گیا تو کیا ہوگا؟" گاڑی نے پھر سیٹی دی اور چل پڑی، میرے آنسو

نکل آئے، جوں جوں اسٹیشن گذرتے جاتے تھے، ایک طرف رنج بڑھتا جاتا تھا اور دوسری طرف اطمینان ہوتا جاتا تھا، صبح ہوئی اور منماڑ آیا لوگوں سے پوچھا، علی گڈھ کی گاڑی کدھر سے آتی ہے، کدھر جاتی ہے؟

"پسنجر یا ایکسپرس؟"

"جو بھی پہلے آئے؟"

پہلی گاڑی پسنجر تھی۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ پسنجر کا سفر ایک دن کے بجائے ڈیڑھ دن میں طے ہوتا ہے، اسی میں سوار ہوگیا، نیت یہ تھی کہ کافی فاصلہ طے ہونے پر درمیان میں کہیں سے ٹکٹ خرید لوں گا۔ چند گھنٹے گذرنے کے بعد معلوم ہوا کہ ٹکٹ کی جانچ ہو رہی ہے، جھٹ سے پاخانے میں چھپ گیا، ٹکٹ کلکٹر کی آواز سے میرا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ساتھی مسافر نے آواز دی "اب نکل آؤ بھائی" میں اپنی جگہ پر چلا آیا لیکن یہ طے کرلیا کہ اب کی دفعہ جو جنکشن آئے وہاں سے ٹکٹ ضرور خرید لوں گا ورنہ پکڑ لیا جاؤں گا، گاڑی جھانسی پر رکی، دیوار پر لگے ہوئے بڑے ٹائم ٹیبل میں اگلا اسٹیشن دیکھا آگرہ نکلا، وہاں کا ٹکٹ خریدا، جان میں جان آئی پھر آگرہ تک کا سفر خوشی خوشی طے کیا۔ وہاں سے علی گڈھ تھوڑی دور رہ گیا تھا۔

مگر اب تو پیسے ختم ہو گئے تھے۔ پلیٹ فارم سے متصل اسٹیشن کے ایک "کوارٹر" میں ریلوے پولیس کا کانسٹبل اور اس کے بال بچے رہتے تھے، گرمیوں کا زمانہ تھا، وہ چارپائی ڈالے وہیں لیٹا تھا، خدا جس کی مدد کرنا چاہتا ہے، اس کے لئے کوئی نہ کوئی صورت پیدا کر دیتا ہے۔ میں دل میں ڈرتا تھا کہ اگر پولیس والے سے یہ کہتا ہوں کہ دام نہیں ہیں اور علی گڈھ جانا چاہتا ہوں، تو شاید آوارہ گردی میں گرفتار کر لے لیکن میں نے جی کڑا کر کے اسے اپنا سارا حال اور یہاں تک کے سفر کی کیفیت مختصر طور پر بتا دی، جوں جوں میں بیان کرتا جاتا تھا، اس کی دلچسپی بڑھتی جاتی تھی، درمیان میں اس نے اپنے لڑکے کو آواز دی کہ وہ کھانا لے آئے، میں نے اپنا بیان جاری رکھا، جب روٹی آئی تو وہ کہنے لگا "پہلے تم کچھ کھا پی لو، علی گڈھ کا سفر کوئی مشکل نہیں ہے، یہاں سے قیدیوں کی ایک جماعت علی گڈھ جا رہی ہے، اپنے ساتھی سے کہہ دوں گا کہ وہ تمہیں اسٹیشن سے باہر چھوڑ دے۔ میں قیدیوں کے ڈبے میں سوار ہو گیا، اسٹیشن پر اتر کر سرائے کا پتہ پوچھا اور وہاں پہونچا، بھوک لگ رہی تھی، دام نہیں تھے۔ میں نے بھٹیارن سے کہا: "میرے پاس دام ختم ہو گئے ہیں، لیکن ایک بڑا سا ریشمی رومال ہے، اگر اس کے بدلے میں دو وقت کا کھانا کھلا دو تو میرا کام نکل جائے گا۔" پہلے تو اس نے

ناک بھوں چڑھائی، پھر کہنے لگی:

"دکھا اپنا رومال"

میں نے پیش کیا، وہ روٹی پکا رہی تھی، رومال کو ایک طرف رکھ لیا، پھر کہنے لگی:

"بیٹھ جا یہیں چولھے کے پاس" پھر برتن میں سالن ڈالتے ہوئے بولی: "کہاں سے آیا ہے، کہیں چوری کا مال تو نہیں ہے۔" کھانا شروع کرتے ہوئے میں نے کہا:

"چوری کیسی؟ کیا سفر میں پیسے ختم نہیں ہو جاتے ہیں؟"

"ارے بابا یہ سرائے ہے، بہتیرے ایسے بھی آویں ہیں۔"

جامعہ میں داخلے سے مایوسی

کھانے سے فارغ ہوا، علی گڈھ کے نئے مدرسے جامعہ کا پتہ پوچھتا ہوا، ڈگی والی کوٹھیوں کے پاس پہونچا، ایک کوٹھی کے احاطے میں ماسٹر برکت علی صاحب پھاٹک کی طرف چلے آرہے تھے، میں سامنے رک گیا، انہوں نے میری طرف نظر اٹھائی، میں نے داخلے کی درخواست دکھائی، انہوں نے پیچھے مڑتے ہوئے انگلی سے ایک مکان کی طرف اشارہ کیا، میں ادھر چل پڑا۔ یہ مکان اس وقت کے نگران رؤف باشا، صاحب کا تھا، اس زمانے میں جامعہ کے دفتر اور مدرسے ڈگی (جوہڑ) کے پاس بڑے احاطہ میں بھوس کی کوٹھیوں میں تھے اور وہیں صدر مدرس اور استاد صاحبان کی دو کوٹھیاں بھی تھیں، ایک طرف بھوس کا بڑا کمرہ اور اس کے سامنے بڑا چبوترہ تھا، اس کا نام "محمد علی ہال" تھا، دوپہر کو پہلی جماعت سے بی۔اے تک کے طلباء اس ہال میں ایک ساتھ کھاتے تھے، ظہر کی نماز بھی جماعت سے ہوتی تھی، گرمیوں کا زمانہ تھا، سب لڑکے گھر چلے گئے تھے، البتہ بی۔اے (سال آخر) کے طلباء اپنے امتحان کی تاریخ بڑھوا کر اس احاطے میں ٹھیرے ہوئے تھے

میں اپنی درخواست لے کر صدر مدرس صاحب کے کمرے میں پہونچا،
درخواست دیکھتے ہی فرمایا:

وظیفوں کا تعلق مجھ سے نہیں ہے، قریب ہی شیخ الجامعہ صاحب
کا دفتر ہے، وہاں تشریف لے جایئے"!

دفتر میں شیخ الجامعہ عبدالمجید خواجہ صاحب اور مستجل حسن حیات
صاحب بیٹھے کام کر رہے تھے، نظام خاں چپراسی باہر بیٹھے تھے
پہلے نظام خاں سے، پھر شیخ الجامعہ سے اجازت لے کر اندر داخل
ہوا۔ درخواست دے کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

شیخ الجامعہ: کیا خوب! وظیفہ اس طرح ملا کرتا ہے؟ خیال آیا اور
گھر سے چل دیئے، جیسے وظیفہ پہلے سے طے ہو، یہاں
ان لڑکوں کی فکر ہے، جن کی درخواستیں، مہینوں پہلے آئی ہوئی
ہیں، ان میں بہت سے غریب ہیں اور انھیں وظیفے کی
ضرورت ہے۔

میں: (دبی زبان سے) میں بھی غریب ہوں۔

شیخ الجامعہ (غصے سے) میں بھی غریب ہوں، غریبوں کے لیے یہی
ایک مدرسہ رہ گیا ہے؟ اور جب اتنے غریب ہو تو یہ ہزار
میل کا سفر کس طرح طے کیا؟

میں : سفر کے لیے تو دام مل گئے تھے ۔

شیخ الجامعہ : تو ان داموں سے خونچہ لگا لیتے، پڑھ کر کیا کرو گے پھر
حیات صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے ۔

خیال فرمائیے، آپ حیدرآباد سے تشریف لائے ہیں،
(ثانوی اوّل) ساتویں جماعت میں داخل ہونا چاہتے ہیں
اور وظیفہ کی درخواست ہے ۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ حیات صاحب مزاحیہ انداز میں گفتگو
کرتے ہیں، کہنے لگے :

" ایکسپرس سے آئے ہو یا پسنجر سے ؟ "

میں نے سچی بات بتادی " پسنجر سے ؟ "

حیات صاحب نے کہا : " تو واپسی میں مال گاڑی سے جانے
میں سہولت رہے گی ۔ "

شیخ الجامعہ : خیر اب آخری بات سن لیجیے، پہلے آپ حیدرآباد واپس
جائیے، اگر پھر بھی یہاں پڑھنے کا شوق باقی رہے تو وہاں
سے درخواست بھجوائیے، جب وظیفہ ملنے کی اطلاع ملے
تو شوق سے تشریف لائیے

پھر دونوں اپنے کام میں مشغول ہو گئے، میں نے دعا یک بار

متوجہ کرنے کی کوشش کی، مگر وہ سنتے ہی نہیں تھے، بڑی دیر کے بعد حیات صاحب نے اشارہ کیا کہ میں باہر چلا جاؤں، وہاں سے نکل کر صدر مدرس صاحب کے مکان پر پہونچا اور انھیں کیفیت سنائی۔

رؤف باشا صاحب (صدر مدرس) بڑے نرم مزاج اور ہمدرد بزرگ تھے، کہنے لگے: "میں پہلے ہی سے کہنے والا تھا کہ جو لڑکے بغیر درخواست کی منظوری کے چلے آتے ہیں، اگر انھیں وظیفہ ملنے والا بھی ہو تو نہیں ملتا ہے، لیکن میں نے خیال کیا کہ ایک دم سے مایوس کیوں کروں"

میں نے سفارش کے لیے کہا، اس پر بھی یہی فرمایا، "قاعدہ یہی ہے کہ اس طرح آنے والے لڑکوں کی سفارش نہیں کی جاتی ہے۔"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ اب کیا کروں، شام تک اس احاطہ میں گھومتا رہا، رات کو سرائے میں آکر سو گیا، عجیب عجیب خواب نظر آئے

دوسرے دن دفتر کھلتے پر پھر جامعہ پہونچا اور شیخ الجامعہ کے کمرے میں چپ چاپ ایک کونے میں بیٹھ گیا، نہ میں نے ان سے کچھ کہا اور نہ انہوں نے، کافی دیر کے بعد میرے آنسو نکل آئے۔ انہوں نے دیکھ تو لیا مگر چپ رہے، اتنے میں حیات صاحب کھڑے

ہوئے اور مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا، میں کچھ امید دل میں لیے اٹھا انھوں نے اپنے اسی مزاحیہ انداز میں کہا:

"شیخ الجامعہ صاحب کی بیوی حیدرآباد کی رہنے والی ہیں، اُن کے پاس چلے جاؤ شاید کام بن جائے۔

ایک کاغذ پر اس وقت تک کا مختصر حال لکھ کر میں ان کے مکان پر پہونچا اور کاغذ اندر بھجوا دیا، تھوڑی دیر میں وہ باہر کے کمرے میں آئیں اور پردے کی آڑ میں فرمایا:

"جب وہ دفتر سے لوٹیں گے سفارش کروں گی، تم کہاں ٹھیرے ہو، کھانے پینے کا کیا انتظام ہے؟"

میں نے کہا ایک جگہ عارضی طور پر ٹھیرنے اور کھانے کا انتظام ہو گیا ہے۔

انتظام کی یہ صورت نکل آئی تھی کہ ان چھٹیوں کے زمانے میں حیدرآباد کے ایک طالب علم محمود علی نگراں صاحب کے مکان میں ٹھیرے ہوئے تھے، انہوں نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ آپ کا کام بنے گا نہیں، البتہ جب تک آپ واپس نہیں جاتے میرے ساتھ کھا لیا کیجیے اور یہیں سو جایا کیجیے

تیسرے دن معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ کی سفارش نے بھی کام نہیں

دیا۔ اس عرصے میں میرا حال بعض منشی صاحبان مثلاً شیخ رشید احمد صاحب، شیخ مفتاح الدین صاحب وغیرہ کو معلوم ہو گیا تھا، سب نے یہی کہا کہ شیخ الجامعہ صاحب روپے پیسے کے معاملہ میں بہت سخت ہیں، ہم لوگ چندہ کر دیں گے، آپ واپس جایئے، واپسی کا نام سن کر مجھے تکلیف ہوتی تھی، خیر یہ دن بھی گذر گیا

چوتھے دن رؤف صاحب ایک شخص سے گفتگو کر رہے تھے، کہ انھیں کھانے پینے کی تکلیف ہے، باورچی کا انتظام ہونا چاہیئے میں نے یہ گفتگو سن لی، تنہائی میں رؤف صاحب سے کہا: آپ کو باورچی کی ضرورت ہے، مجھی کو رکھ لیجیے، کچھ پڑھ بھی لیا کروں گا۔"

وہ تعجب سے کہنے لگے

آپ کھانا پکانا جانتے ہیں ؟

میں نے کبھی کھانا پکایا تو نہیں تھا، لیکن قدم جمانے کی یہی صورت تھی کہ ہاں کہہ دوں، میں نے کہا :

" کام چلانے لائق جانتا تو ہوں اور سیکھ لوں گا۔"

وہ خوش ہو گئے کہ ایک پڑھا لکھا لڑکا اس کام کے لیے مل رہا ہے، حساب کتاب بھی لکھ لیا کرے گا، مجھے باورچی خانہ کی تمام چیزیں اور پچھلا بچا ہوا دال آٹا دکھلا دیا، اپنے ساتھیوں

سمیت کو بی چار آدمیوں کے کھانے کے لیے کہا، ان میں سے ایک بڑے
کتب خانہ کے مہتمم سید محمد صاحب تھے، دوسرے محمود طالب علم، تیسرے
مالابار کے ایک اور طالب علم۔ میں نے قریب کی دُکان سے گوشت خرید لیا،
مجھے ایسا معلوم ہوا، جیسے کسی خواب کی دُنیا میں پہونچ گیا ہوں، کچھ اور
سوچنے کا موقع نہیں تھا کہ وقت گذرا جا رہا تھا، گھر میں والدہ اور بہن کو
پکاتے ہوئے دیکھا تھا، بس اس کی نقل کی کوشش شروع کر دی، ہر تھوڑی
دیر میں باورچی خانے سے نکل کر آس پاس نظر ڈال لیا کرتا تھا کہ
کوئی دیکھنے کے لیے تو نہیں آرہا ہے، جب میں نے یہ دیکھا کہ رؤف
پاشا صاحب اور ان کے ساتھی کھیل کے میدان کی طرف جا رہے ہیں
تو اطمینان ہوا کہ پکاتے ہوئے تو کوئی دیکھے گا نہیں۔ سالن تو جیسا تیا
پک ہی رہا تھا، روٹی پکانے کے لیے جب آٹے میں پانی ڈالا، اور
اُسے ملانا شروع کیا تو دونوں ہاتھ لت پت ہو گئے، یہ نہیں معلوم تھا کہ
اچھی طرح گوندھنے سے ہاتھ صاف ہو جاتے ہیں، کبھی ان کو صاف
کرتا، کبھی آٹے میں پانی ملاتا، جس سے وہ پتلا ہو جاتا، کبھی آٹا ملا دیتا،
جس سے وہ خشک ہو جاتا، اس طرح میرے سامنے آٹے کا ایک ڈھیر
لگ گیا، اب تو میری گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی، مگر ضرورت یہی کہہ رہی
تھی کہ "جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو، کھانے کا وقت قریب آرہا ہے۔"

آٹے میں اتنا بھی کس نہیں تھا کہ وہ چپاتی کی طرح پھیلتا، البتہ پتلے پتلے بسکٹوں کی طرح ضرور پھیلا، توے پر اُلٹنے پلٹنے میں بھی گڑبڑ ہو جاتی تھی۔ روٹیاں جلنے اور انگلیوں کو جر کے لگنے کے بعد کچھ کچی پکی موٹی روٹیاں تیار ہو ہی گئیں۔ مغرب کے بعد محمود صاحب (جن کا ذکر پیش پہلے کر چکا ہوں) کی مدد سے دستر خوان لگایا اور وہ تینوں چیزیں، دال گوشت، روٹی جو ایک ہی انداز کی تھیں، لا کر رکھیں۔

نگراں صاحب اور ان کے ساتھی کھیل کی باتیں کرتے ہوئے دستر خوان پر بیٹھے، میں کہتا تھا "الٰہی خیر" کھانے کی طرف دیکھتے ہوئے ایک نے میری طرف اشارہ کر کے کہا:

"آپ حیدر آباد سے آئے ہیں۔"

دوسرے نے کہا:

"کھانے کی رنگت پر نہ جائیے، اصل چیز ذائقہ ہے؟

نگراں صاحب نے کھاتے ہوئے کہا

"بھائی دراصل آپ پڑھنے کے لیے آئے ہیں، مگر وظیفہ نہ ملنے کی وجہ سے مجبوراً کچھ دن اس کام کے سہارے گذر کرنا چاہتے ہیں۔

چوتھے نے کہا:

"تو اس اعتبار سے یہ کھانا بہت اچھا پکا ہے۔"

مجھے ایسا معلوم ہوا کہ آج ہمت سے کام لینے کی وجہ سے میرے کئی ہمدرد پیدا ہو گئے ہیں، دوسرے دن نگراں صاحب نے شیخ الجامعہ صاحب سے میری نصف دن کی سرگذشت سناتے ہوئے سفارش کی کہ کم سے کم کہیں ملازم ہی رکھوا دیا جائے، شیخ الجامعہ صاحب نے جامعہ کے چھاپے خانے میں آٹھ روپے ماہوار پر ملازم رکھوا دیا۔ کام یہ تھا کہ "دستی پریس (ہاتھ کی چھپائی کی مشین) پر چھپائی کے وقت ڈنڈا گھمانا پڑتا تھا، یہ بات جون ۱۹۲۳ء کی ہے، اس وقت میری عمر سترہ سال کی تھی، چھاپہ خانہ شیخ الجامعہ کے دفتر سے ایک فرلانگ پر پکے مکان میں تھا، لیتھو اور ٹائپ کی چھپائی، جلد سازی، سب طرح کا کام ہوتا تھا، عملہ بھی کافی تھا، عبدالعلی صاحب منیجر تھے، منیجر صاحب کی طرف سے یہ اعلان تھا کہ جس مشین کے لوگ ہزار فارم چھاپ لیں، باقی وقت وہ آرام کر سکتے ہیں، ہماری مشین پر کام کرنے والے مزدور اپنا کام جلدی ختم کر لیتے تھے، پھر میں انھیں اخبار پڑھ کر سنایا کرتا تھا، اس وجہ سے میرے ساتھی میرا ہاتھ بٹا کر میرا بوجھ ہلکا کر دیتے تھے، منیجر صاحب کی چٹھیاں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچا دیتا تھا، چھاپے خانے کے ایک کمرے میں سعید الرحمٰن صاحب نگینہ والے "پروف ریڈر" رہتے تھے

انہوں نے سونے کے لیے جگہ دے دی تھی، کیونکہ ان کا کھانا مطبخ سے لا دیا کرتا تھا، اپنے لیے چار روپے کا درجہ دوم کا کھانا جاری کرالیا تھا، جس میں دال روٹی ملتی تھی، اس طرح باقی چار روپے اور کاموں کے لیے بچ جاتے تھے۔

جولائی میں مدرسہ کھلا اور لڑکے آنے شروع ہوئے، اس زمانے میں گرمیوں کی چھٹیاں مئی اور جون میں ہوا کرتی تھیں، کالج کے لڑکے "کرشنا کوٹھی" اور "بنگالی کوٹھی" میں رہتے تھے، ابتدائی اور ثانوی کے طلبہ مطبخ سے متصل، فرید منزل، دل کشا منزل، مشرق منزل اور بھی بارک میں تھے۔ ان کے اتالیق حافظ فیاض احمد صاحب اور نذیر نیازی صاحب تھے، میرے لیے لڑکوں سے ملنے ملانے اور ان کی رات کی پڑھائی میں شریک ہونے میں سہولت ہو گئی تھی، انگریزی کے سوا باقی سب مضامین میں، میں ثانوی اول والوں سے کچھ آگے ہی تھا، بس انگریزی کی کمی پوری کرنی تھی، سو اس کے لیے مطبخ کے منیجر صاحب کی سفارش سے ایک گھنٹہ کے لیے ثانوی میں بیٹھنے کی اجازت مل گئی تھی، اس طرح میرا نام جماعت کے رجسٹر میں درج ہو گیا، اور بزم کمال کے جلسوں میں بیٹھنے کا حق مل گیا، اس وقت حافظ صاحب کی نگرانی میں مدرسہ کی یہ انجمن بہت زوروں پر تھی، انعامی مقابلے،

مدرسہ کے مسائل، حالاتِ حاضرہ، اور دوسرے بحث طلب موضوعات پر مباحثے، مضمون نویسی، نظم خوانی، غرض طرح طرح کے دلچسپ پروگرام ہوا کرتے تھے، سچ تو یہ ہے کہ جمعرات کا دن جب یہ جلسے ہوا کرتے تھے سب لڑکوں کے لیے بڑی خوشی کا دن تھا، اس زمانے میں کالج میں بہت لڑکے تھے، کیونکہ یہ سب علی گڑھ کالج اور دوسرے سرکاری و امدادی مدرسے چھوڑ کر آئے تھے: ان کی دو انجمن "اتحاد" بھی عروج پر تھی۔ جلسے "محمد علی ہال" میں ہوتے تھے، ابتدائی اور ثانوی کے لڑکوں کو ان جلسوں میں شریک ہونے کا موقع ملتا تھا، بیشتر اُستاد بھی ان میں حصّہ لیتے تھے، اس انجمن کے اثر سے "بزم کمال" میں جان پڑ گئی تھی۔ کبھی کبھی ہم "سیر و تفریح" (اکسکرشن) کے لیے باہر جایا کرتے تھے، خصوصًا گنتے پیلے جانے کے زمانے میں، لڑکے زیادہ ہونے کی وجہ شام کے وقت جہاں تہاں کھیل ہی کھیل نظر آتے۔

اس سال ترکوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنے یہاں جمہوری حکومت قائم کریں گے، سلطان کو فرماں روائی کے اختیارات سے محروم کر کے صرف خلیفہ رہنے دیں گے، یہ فیصلہ ٹھیک تھا یا نہیں، اس کی بحث ثانوی کے انعامی مقابلے کے لیے رکھی گئی تھی، مجھے خود تو حالات معلوم نہیں تھے، لیکن کالج کے ایک لڑکے سے ایک تقریر لکھوائی تھی
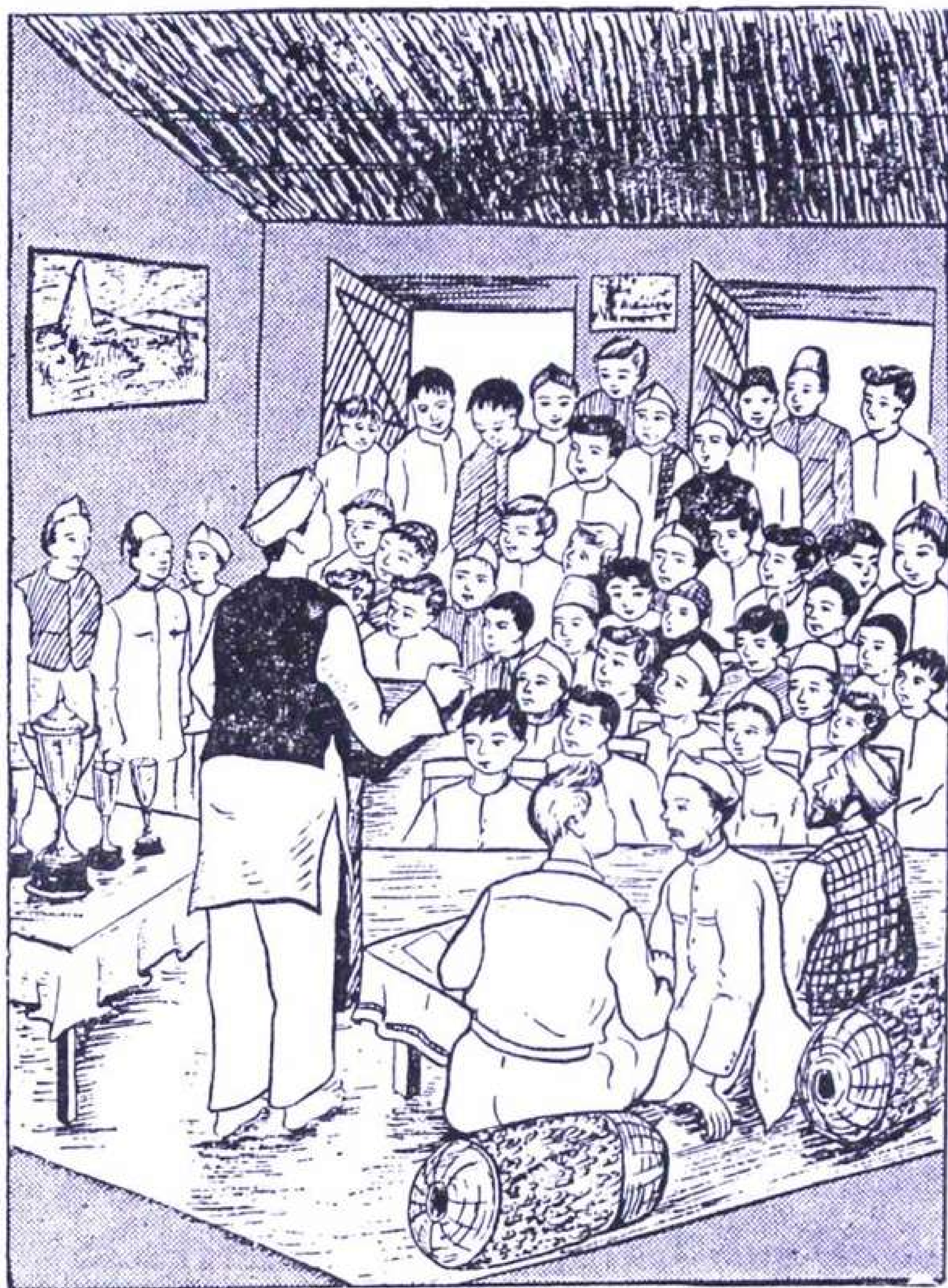
اور جنگل میں جاکر دُہراتا تھا، مدرسہ کے ایک اُستاد محمد ابراہیم صاحب سے جو فنِ تقریر میں اچھی واقفیت رکھتے تھے بولنے کا طریقہ سیکھتا تھا اور مشق کے طور پر چند ساتھیوں کے سامنے رٹی ہوئی تقریر سناتا تھا۔ مقابلہ کا دن آیا سب لڑکے اور استاد جمع تھے، تقریر شروع کی تو بات بات پر تالیاں بجتی تھیں۔ جب نتیجہ سُنایا گیا تو معلوم ہوا کہ پہلا انعام مجھے ملا ہے، پھر تو لڑکوں سے میل ملاپ بڑھنے لگا، وہ مجھے حیرت سے دیکھتے تھے کہ اس قدر غریبی یہ مزدوری کا کام اور پڑھنے لکھنے کے مقابلہ میں ایسی شاندار کامیابی!

انھیں سردیوں میں دہلی میں کانگریس کا خاص جلسہ ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا خطبۂ صدارت جامعہ ہی کے مطبع میں تیار ہو رہا تھا۔ مطبع کے لوگ رات دن کام میں لگے ہوئے تھے، منیجر صاحب نے یہ دیکھ کر کہ مجھے جلسوں سے دلچسپی ہے، کہہ دیا تھا کہ خطبہ کے تیار ہونے پر اسے دہلی پہونچانے والوں میں مجھے بھی شامل کرلیں گے، اسی طرح پہلی دفعہ کانگریس کا بڑا جلسہ دیکھنے کا موقع ملا

اس جلسے میں اس بات پر بحث چھڑی ہوئی تھی کہ آیا کانگریس والے آئین ساز مجلسوں کا بائیکاٹ جاری رکھیں یا اس پالیسی کو تبدیل کردیں اور کونسلوں کے انتخابات میں جو چند مہینے بعد ہونے والے تھے

حصہ لیں، مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان دو پارٹیوں میں کس قسم کے اختلافات ہیں، لیکن جی چاہتا تھا کہ تبدیلی کے مخالف جیت جائیں۔

"بزم کمال" کے جلسوں کی بدولت ایک شخص سے ایسی دوستی ہوگئی، جو آج تک قائم ہے۔

عبدالوحد صاحب سندھی (جو ہو ہولوں ایک اخبار کے مدیر ہیں) میری طرح ہی بے سروسامان تھے، بس اتنا فرق تھا کہ انھیں، سندھ کے کسی دل والے نے وظیفہ دے کر جامعہ بھیجا تھا اور میں مزدوری کر کے پڑھتا تھا، وہ ابتدائی ششم میں داخل ہوئے تھے، اور کئی دفعہ بزم کمال کے جلسوں میں سب سے زیادہ تقریریں کرنے کا انعام لیا تھا، زیادہ بحث کرنے کی وجہ سے یہ جھگڑالو مشہور ہو گئے تھے، ہم دونوں کے حالات ایک سے تھے، اس لیے ایک دوسرے سے مانوس ہو گئے تھے اور گھل مل کر باتیں کیا کرتے تھے، ایک موقع پر طویل گفتگو کے بعد سنجیدگی سے اور قسمیں کھا کر ہم دونوں میں معاہدہ ہوا کہ جامعہ سے پڑھ کر ایسے دیہات میں جائیں گے جہاں پہلے سے مدرسہ نہ ہو، لڑکوں کو جمع کر کے چوپال میں پڑھائیں گے۔ ہمارا خرچ ہی کیا ہے پیٹ تو بھر ہی جائے گا، II جماعتوں کے لیے دو استاد بہت ہیں، جامعہ کے نصاب کے مطابق تعلیم دیں گے، سال بھر تک کسی جاننے والے کو

پتہ نہ دیں گے کہ ہم لوگ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں، جب سال گذر جائے گا تو شیخ الجامعہ صاحب کے پاس درخواست بھجوائیں گے کہ وہ اس مدرسہ کا معائنہ کریں، چونکہ نتیجہ اچھا ہوگا، اس لیے وہ اس مدرسے کو جامعہ کی شاخ بنالیں گے۔ مدرسے میں جو مال دار لڑکے پڑھتے ہیں، جب یہ بڑے ہو جائیں گے تو ان سے درخواست کریں گے کہ وہ دیہات کے مدرسے کی عمارت کے لیے چندہ دیں

جامعہ میں ہمارے ساتھ بعض مال دار لڑکے پڑھتے تھے' ان سے اسی وقت اپنے منصوبے کا ذکر کرنے کو جی چاہتا تھا، مگر یہ خیال کر کے کہ یہ بات عام ہو گئی تو لوگ مذاق اڑائیں گے، اسے چھپائے رکھا کسے معلوم تھا کہ اللہ میاں ہماری آرزو کو کسی اور ہی شکل میں پورا کریں گے، یہ باتیں مشرف منزل (ایک اقامت گاہ) میں ہوئی تھیں، اس لئے آج تک ہم اسے "معاہدہ مشرف منزل" کے نام سے یاد کرتے ہیں، اس آرزو کی تکمیل کی روئداد " مدرسہ ابتدائی کی کہانی" کے نام سے الگ سے شائع کی ہے۔

سالانہ امتحان اپریل میں ہوئے۔ میں بھی ثانوی اول کے طلبا کے ساتھ امتحان میں شریک ہوا، جب نتیجہ سنایا گیا تو کامیاب نکلا۔ اس طرح ایک سال گذر گیا، طلبہ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے ہیں

بدستور مطبع میں کام کرتا رہا۔ ساتھیوں کے چلے جانے سے دل پر اُداسی رہتی تھی، لیکن اس خیال سے اطمینان ہوتا جاتا تھا کہ دو مہینے بعد مدرسہ کھل جائے گا

کالج کے چند طلبا، چھٹیاں گذارنے کے لیے جامعہ ہی میں ٹھیرے ہوئے تھے، اکبر علی صاحب سے پہلی بار دوستی ہوئی، ان کی خوش باشی اور آزاد روی سے میری طبیعت میل کھاتی تھی اس لیے اُن سے دوستی کرنے میں دشواری نہیں ہوئی ہمارے گروہ کے ایک اور سرغنہ وحید اللہ صاحب بھی موجود تھے، ہم لوگوں کا یہ معمول تھا کہ شام کے وقت خربوزوں کے کھیت پر خربوزے کھانے جاتے تھے، اور رات کو حاجی موسیٰ صاحب کے یہاں گپ شپ رہا کرتی تھی

باقاعدہ داخلہ مل گیا

جامعہ میں ابتدا ہی سے حرفہ کی تعلیم لازمی تھی۔ اس کی رو سے مدرسے کے بچوں کو جلد سازی، پارچہ بافی، قفل سازی، چھپائی، ٹائپ، مختصر نویسی (شارٹ ہینڈ) خوش خطی میں سے کسی ایک چیز کا سیکھنا لازمی رکھا گیا تھا، ثانوی اول کی کامیابی اور مطبع میں کام کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے پھر وظیفہ کی درخواست دی، شیخ الجامعہ صاحب فرمانے لگے، اگر پورا وظیفہ دیا گیا تو اس کی بے قدری کا اندیشہ ہے، یہ ہو سکتا ہے کہ تم جو کچھ کماتے ہو وہ مطبخ میں دے دو، باقی رقم (اُس وقت مدرسے کی فیس ۱۵ روپے بارہ آنے تھی) کا وظیفہ منظور کر کے ہم تمہیں باقاعدہ طالب علم بنا لیتے ہیں، اگر استادوں کی سفارش ہوئی کہ پڑھنا ان کے لیے مفید ہے تو کام کے گھنٹوں میں کمی کر دی جائے گی، ورنہ چھاپے خانے کی سند مل جائے گی۔

اب مجھے اطمینان ہوا کہ آئندہ کا فیصلہ میرے کام پر منحصر ہے پہلی دفعہ لڑکوں کے ساتھ رہنے کے لیے "کچی بارک" کے اقامت خانے میں جگہ ملی، میرے کمرے کے ساتھی برار کے رہنے والے مقصود تھے،

زمیندار کے لڑکے بڑے محبتی اور ملنسار تھے، خود تو کم پڑھتے تھے، لیکن میرے کام کی قدر کرتے تھے، جب تک جامعہ میں رہے، ہر سال مجھے اپنا روم فیلو (کمرے کا ساتھی) بنایا۔ سیر و تفریح اور دوسرے کاموں کے لیئے جتنے بھی چندے ہوتے تھے، میری طرف سے ادا کردیتے تھے، جب بھی کمرے بدلے جاتے، اتالیق صاحبان کہا کرتے "ہیولی اور مقصود تو ایک ہی کمرے میں رہیں گے"۔ بات یہ تھی کہ میں ان کی شرافت اور قدر شناسی کا مداح تھا، وہ میری زندہ دلی اور محنت کو سراہتے تھے، ہر طرح کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی وجہ سے میرا میل جول سب ہی لڑکوں کے ساتھ بڑھتا گیا، خاص طور پر ابتدائی مدرسے کے لڑکے مجھ سے بہت خوش ہوتے تھے، جہاں کہیں ان کی ٹولی دیکھتا، وہیں چلا جاتا، ان کی اور ان کے کھیل کی نقلیں مزے لے لے کر کرتا، قلا بازیاں لگاتا، مجھے یہ اپنے کھیل میں شریک کرلیتے تھے، اس موقع پر اختر امام (حسن امام کے رشتے دار جو اب ڈاکٹر اختر امام پروفیسر شعبہ اسلامیات ہیں) بہت یاد آتے ہیں، ان کی عمر کوئی دس سال کی ہوگی، اچھے خاصے شریر مگر بہت ہنس مکھ تھے؛ ——————

—— مجھ سے بہت مانوس تھے، جہاں کہیں دیکھ پاتے کسی نہ کسی نقل کی فرمائش کرتے اور بہت ہنستے، میری پیٹھ پر سوار ہوجاتے

اُسی زمانے میں بزمِ کمال کے سالانہ انتخابات ایسے ہی جوش و خروش کے ساتھ ہو رہے تھے، جیسے میونسپلٹی، کانگریس یا اسمبلی کے ہوتے ہیں، محمود صاحب (ذاکر صاحب کے چھوٹے بھائی) کی صدارت کے لیے تو سب متفق تھے، لیکن باقی عہدیداروں کے لیے بڑا سخت مقابلہ تھا، محمود صاحب کہا کرتے، بھائی مدھولی (وہ مجھے اب تک اسی نام سے پکارتے ہیں) کسی سے کہنا مت، جی تو یہی چاہتا ہے، کہ تمہاری پارٹی کی وزارت کامیاب ہو جائے، میں بھلا ایسی بے وقوفی کی بات کیوں کرتا، جس سے صدارت کے معاملے میں بھی جھگڑا پڑ جائے، اسی انتخاب میں ڈے اسکالروں کے گھروں پر ووٹ مانگنے جانا پڑا، بالآخر ہماری پارٹی جیت گئی، میرا نام مجلس منتظمہ کی رکنیت کے لیے رکھا گیا تھا، دوسری پارٹی والے کہا کرتے تھے ہماری طرف آ جائیے، آپ کا نام ہم اپنی طرف رکھ لیتے ہیں۔ مجھے کسی سے دشمنی تو تھی نہیں، یہی جواب دیتا کہ کسی ایک طرف ہونا تھا ادھر یا اُدھر اب جو فیصلہ کر لیا وہ کر لیا۔

ہر جمعرات کو کسی موضوع پر بحث ہوتی تھی، میں بھی اس میں حصہ لیتا تھا، ہم لوگ پہلے سے طے کر لیتے تھے کہ فلاں فلاں لڑکے موضوع کی موافقت کریں اور فلاں فلاں مخالفت، ہم ایک دوسرے

کے نکاتِ مضمون دیکھ کر دلیلیں تلاش کر لیتے تھے۔

انجادی دُکان کو قائم ہوئے ایک سال ہو گیا تھا مگر کام کو بڑھانے کی ضرورت تھی، ہمارے اتالیق حافظ صاحب نے کچھ وقت کے لیے مجھے مقرر کیا، وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح بکری بڑھے، اور بھی کئی ساتھی باری باری سے کام کرتے تھے، ایک تو ہم نے اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ دُکان کھلی رہنے کے جو وقت ہیں، اُن میں فرق نہ آئے گا، دوسرے تازہ مٹھائیوں کے اشتہار روز کے روز لگاتے تھے، لکھنے پڑھنے کا سامان خریدنے کے لیے کسی کو بازار جانے کی ضرورت ہی نہ ہونے دیتے تھے، جو لڑکا جس چیز کی فرمائش کرتا جھٹ سے اس کا انتظام کر دیا جاتا تھا، سردیوں میں حلوے کا انتظام تھا، غرض کسی لڑکے کو شکایت کا موقع نہ دیا جاتا تھا، اگر کوئی باہر سے کچھ خریدتا بھی تو لڑکے کہتے، آخر کیا وجہ ہے کہ تم یہاں سے نہیں خریدتے ہو، دُکان والوں نے کبھی تمہاری فرمائش ٹالی۔

دُکان پر جتنی چیزیں آئیں وہ رجسٹر کے صفحے پر ایک طرف لکھ دیتے اور جو کچھ بکتیں وہ دوسری طرف، اس طرح مقابلہ کرنے کا موقع مل جاتا۔ روزانہ رات کو دن بھر کی بکری اتالیق صاحب کو لے جا کر دیتے روزانہ حساب کتاب کی چاٹ اتالیق صاحب کو ایسی لگی کہ جب کبھی

مغرب کے بعد حساب دینے میں دیر ہو جاتی تو وہ کہا کرتے : " ارے بھائی میں انتظار کر رہا ہوں جو کچھ دینا ہو دے دو۔" سال کے آخر میں اس دُکان سے مجھے بیس رُوپے کا پہلا انعام ملا۔ یہ رقم، کپڑے بنانے میں بہت کام آئی۔

مدرسہ میں جہاں "جوہر" اور "چمن" جیسے سنجیدہ رسالے نکلا کرتے تھے، وہیں "لوقان" اور "پنچ" کے نام سے مزاحیہ رسالے بھی موجود تھے۔ "لوقان" کے مدیر فیاض حسین صاحب اور پنچ کے مدیر ایک اور صاحب تھے۔ ان رسالوں میں مذاق مذاق میں کام کی باتیں کہہ دی جاتی تھیں اور ہنسانے والے کارٹون بھی ہوتے تھے، میں نے سوچا بڑی انجمنوں کی نقل میں کیوں نہ ایک چھوٹی سی کلفرکی انجمن قائم کریں میں نے عبدالواحد صاحب سندھی کی مدد سے ایسی انجمن قائم تو کی لیکن ایک معاملے میں ایسی خفت اُٹھانی پڑی کہ پھر میں نے اس کی طرف توجہ نہ کی بات یہ تھی کہ علی گڈھ کی نمائش ہو رہی تھی، تھیٹر کمپنی بھی آئی ہوئی تھی۔ اس کے تماشے تو رات کے پچھلے پہر ہوتے تھے، مگر ہمیں اس وقت تک نمائش میں رہنے کی اجازت نہ تھی، بہت سے لڑکے تماشا دیکھنا چاہتے تھے، میں نے کہا اس کی ایک ہی صورت ہے، اس وقت تو اقامت گاہ لوٹ چلو، رات کی حاضری دے کر چوری چھپے چلے آئیں گے

رات کو کوئی نو بجے تک اتالیق صاحب (ان دنوں حافظ فیاض احمد صاحب تھے) کے کمرے کے گرد چکر کاٹتے رہے، جب وہ سو گئے تو ایک غول کا غول تماشہ دیکھنے چلا آیا، صبح کو یہ خبر پھیل گئی، معاملہ نگراں صاحب تک پہونچا، رؤف باشا صاحب کسی اور مدرسے میں منتقل ہو گئے تھے، کچھ دنوں کے لیے حیات صاحب پھر عبدالکریم صاحب فاروقی نگراں ہوئے تھے، فاروقی صاحب فوراً غصّہ میں آجاتے تھے، اور نرم بھی جلد پڑ جاتے تھے، طبیعت میں اُتار چڑھاؤ تھا، ان کی باتوں پر ہنسی بھی بہت آتی تھی۔ مجرموں کی قطار کی قطار ان کے سامنے کھڑی ہوئی، یہ تو معلوم ہی ہو گیا تھا کہ لڑکوں کو جمع کرنے والا میں ہی تھا۔ فرمانے لگے: "کہاں ہے مدہولی؟" (سب میری طرف دیکھنے لگے)۔ ماشاءاللہ! اکیلے جی نہیں لگتا تھا تو دو چار لڑکوں کو لے جاتے، یہ آدھا بورڈنگ ہاؤس ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟

"سب اپنی خوشی سے گئے تھے" میں نے دبی زبان سے کہا۔

"چل چل، سب اپنی خوشی سے گئے تھے" صفائی بھی پیش کرتا جاتا ہے۔

"ہاں صاحب ہم سب اپنی خوشی سے گئے تھے" چند آوازیں سنائی دیں

"آپ لوگ خاموش رہیے" ہماری اور مدہولی کی باتیں ہو رہی ہیں" پھر میری طرف مخاطب ہوکر (مذاق کے انداز میں) کہنے لگے :-

" مدہولی، ہمارے لڑکے جو اس قدر نیک، شریف، بھولے بھالے اور تھیٹر سے نفرت کرنے والے ہیں، تمہاری باتوں میں کیسے آ گئے۔" اس پر سب لڑکے ہنس پڑے

" یہ نہ سمجھو کہ معاملہ ہنسی ہنسی میں ٹل گیا۔" حافظ صاحب سے مخاطب ہوکر جو ہمارے اتالیق تھے کہنے لگے:-

" حافظ جی! ناظم مطبخ کو لکھ دیجئے کہ آج سے ان لڑکوں کو بطور جرمانہ، ایک ہفتہ تک دال کھلائی جائے۔" (سب کی طرف مخاطب ہوکر) "دفع ہو جائیے یہاں سے"

اس طرح ایک ہفتہ تک دال کھانی پڑی۔

یہ سال جامعہ کے اُستادوں کے لیے آزمائش کا سال تھا، خلافت کی تحریک بے جان پڑ گئی تھی، جو امداد خلافت کمیٹی سے جامعہ کو مل رہی تھی وہ بند ہوگئی، حکیم اجمل خاں صاحب امیر جامعہ نے یہ تجویز سب کے سامنے رکھی کہ اگر جامعہ دہلی میں منتقل ہو جائے تو وہ زیادہ توجہ دے سکیں گے، کالج اور مدرسہ کی انجمنوں میں بھی اس بارے میں

بحث ہوئی، سب لڑکوں کی یہی رائے تھی کہ جامعہ کو علی گڈھ ہی میں رہنا چاہیئے، مگر استادوں نے سمجھایا کہ ایک ہی مقام پر مسلمانوں کے دو مدرسے رہنے پر آپس میں مخالفت کا اندیشہ ہے، بالآخر ۱۷ مارچ ۱۹۲۵ء کو ہمارے بزرگوں نے فیصلہ کیا کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں جامعہ دہلی میں منتقل ہو جائے، ڈاکٹر انصاری نے معتمد کے فرائض اپنے ذمّے لے لیے۔

چھٹیوں میں سامان منتقل ہونے لگا، لیکن مطبع کے متعلق طے ہوا کہ اس کی منتقلی ابھی نہ ہوگی، مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرا کام شاید پھر بگڑ جائے گا۔ میں نے شیخ الجامعہ کے نام ذیل کی باتوں پر مشتمل ایک درخواست لکھی کہ پچھلے دو سال میں، میں:

۱۔ ثانوی اوّل اور دوم کے امتحانات میں کامیاب رہا ہوں۔
۲۔ مدرسہ کی انجمن کی مجلس منتظمہ کا کارکن بن گیا ہوں۔
۳۔ تقریر میں پہلا انعام حاصل کیا ہے
۴۔ اتحادی دکان سے بھی اچھی کارگزاری کی وجہ سے پہلا انعام ملا ہے

(شیخ الجامعہ) عبدالمجید خواجہ صاحب سامان بھجوانے میں مصروف تھے، میں بھی کام کر رہا تھا، فرمانے لگے، "آپ کی درخواست آنے

سے پہلے ہی دہلی جانے والوں میں آپ کا نام لکھ لیا گیا ہے

اب تو میں اور خوشی خوشی کام کرنے لگا، گھر سے چلے ہوئے دو سال ہو چکے تھے، راز دار ساتھی کے خط سے معلوم ہوا تھا کہ والدہ بہت پریشان ہیں اور اکثر رویا کرتی ہیں۔ میں نے خط و کتابت جاری رکھنے کا ارادہ کر لیا، بھائی صاحب کو اپنا موجودہ حال بتاتے ہوئے انھیں لکھا کہ ہمارا مدرسہ دہلی منتقل ہو رہا ہے، وہاں کے پتے پر خط و کتابت جاری رکھیں۔

جامعہ کا چھٹا سال جولائی ۱۹۲۵ء کو دہلی میں شروع ہوا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں مجھے یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ عبدالواحد صاحب نے وظیفہ پر کچھ جھگڑا پڑ گیا ہے اور وہ مایوسی کی حالت میں کراچی گئے ہیں۔ میں نے انھیں خط لکھا کہ آپ یہاں محنت مزدوری کر کے تعلیم جاری رکھ سکتے ہیں، اس وقت میرے پاس چلے آئیے، چھٹیوں بھر آپ کے گذارے کا میں ذمہ دار ہوں، جب یہ لوٹ کر آئے تو میرے پاس تھوڑے سے پیسے تھے، ہم دونوں نے اسٹیشن کے پاس ایک بھٹیارے سے معاملہ کر لیا تھا، دونوں وقت کھانے کے لیے وہیں چلے جاتے تھے، اس بے سرو سامانی کی حالت میں ایک ساتھی کی مدد کر کے جو خوشی مجھے حاصل ہوئی وہ ایک لازوال نعمت معلوم ہوتی ہے۔

جامعہ دہلی میں

مقام کی تبدیلی کی وجہ سے لڑکوں کی تعداد کم ہوگئی، قرول باغ میں طبیہ کالج سے متصل چند کوٹھیاں لی گئی تھیں، اسی میں سب لوگ رہتے تھے، تھوڑے ہی دنوں بعد ان کوٹھیوں کو چھوڑ کر ایک بہت لمبی دو منزلہ عمارت لی گئی، اس میں ابتدائی، ثانوی اور کالج کے سب طلبہ آ گئے۔

علی گڈھ میں سہ پہر کی پڑھائی ختم کرنے کے بعد ڈرل ہوتی تھی، دہلی منتقل ہونے کے بعد جب سب لڑکوں کے اتالیق کیلاٹ صاحب ہوئے تو انہوں نے صبح کی ورزش کا قاعدہ مقرر کیا، جامعہ کے چھوٹے بڑے سب لڑکے صبح کی نماز کے بعد ایک میدان میں جمع ہوکر ایک ساتھ ورزش کرتے تھے، یہ طریقہ اب تک رائج ہے، مگر اب مدرسہ ابتدائی، مدرسہ ثانوی اور کالج کی ورزش الگ الگ ہوتی ہے۔

اس دفعہ انتخابات کی چہل پہل پہلی سی نہیں تھی، میں ہونے کو تو ناظم کتب خانہ (بزم کمال) ہو گیا، مگر ۱۹۲۴ء کا سا لطف کہاں جلسے ٹھنڈے پڑ گئے تھے، دعوتیں بے لذت ہو گئی تھیں جماعتوں میں

وہ رونق نہیں تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بڑی دکان ایک مقام پر دیوالیہ ہوکر دوسری جگہ آئی ہے اور یہاں اپنے ٹوٹے پھوٹے سامان کی مرمت کر رہی ہے، اس امید پر کہ اس کا کام پھر چل پڑے گا۔ جامعہ کے کارکنوں میں بھی کمی ہوگئی، اس لیے بعض کام کالج کے لڑکوں کو سنبھالنے پڑے مثلاً رسالۂ جامعہ کے مدیر نورالرحمٰن صاحب کی جگہ یوسف حسین خاں صاحب (آج کل علی گڈھ کے پرو وائس چانسلر ہیں) ہوئے۔ مکتبہ کا کام یکے بعد دیگرے اکبر علی صاحب اور منظور احمد صاحب نے سنبھالا حافظ صاحب نے (جو اب تک مدرس اور اتالیق تھے) دفتری کام کی ذمہ داری لی، ثانوی کے بعض گھنٹے کالج کے طلبا پڑھایا کرتے تھے حارث صاحب کی اذان سب لوگ یاد کرتے تھے، لیکن انہوں نے ایک سال کے بعد صورت دکھائی، مؤذن کی خدمت کے علاوہ انہوں نے مطبخ کی نظامت کا کام سنبھالا اور اس میں جان ڈال دی، جگہ کی تبدیلی سے طبیعتوں کی تبدیلی تھوڑی ہو جاتی ہے، ایک دن فاروقی صاحب ثانوی چہارم سے کہنے لگے (اس جماعت میں، میں بھی شامل تھا۔)

"استاد جی ان جھگڑوں کو۔ اس کی کمی ہے، اس کی کمی ہے، نکالو اپنی کتابیں۔

"سب نے اپنے سبق نکالے۔

"مگر بند کرو، ان کتابوں کو —— یہ بھی کوئی کلاس ہے، پہلے اس جماعت میں تیس لڑکے تھے، اب دس ہیں، ان میں سے ایک مدہولی ہے، جسے انگریزی خاک نہیں آتی، رہ گئے نو لڑکے، ان کا کیا پڑھانا۔

(میری طرف مخاطب ہوکر) "حیدرآباد سے مون سون کے آنے میں بھی کئی دن لگتے ہیں، یہ تم کیسے آن ٹپکے؟" ایک لڑکے نے کہا:

"گڈس ٹرین میں بیٹھ کر۔"

اس پر فاروقی صاحب بولے: "تب ہی تو کہتا ہوں، گڈس ٹرین میں بیٹھ کر آنے والوں کو کہیں انگریزی آیا کرتی ہے، پچھلے سال اتحادی دکان میں دودھ بیچا کرتا تھا، اس سال بھی دودھ کی دکان کھول لے۔"

ایسی باتیں وہ دلچسپی کے لیے کہا کرتے تھے، پھر بھی بعض دفعہ میں اداس سا ہوجاتا تھا، اب کی بھی ایسا ہی ہوا، فرمانے لگے:

"لو بھائی! مدہولی خفا ہوگیا، اچھا تو نکالو اپنی کتابیں، بتاؤ کل کہاں تک پڑھا تھا۔"

سبق شروع ہوگیا، لیکن اس دفعہ میری طبیعت پھر بھی اُداس رہی۔ فاروقی صاحب اپنے شاگردوں کو خفا کرنے کے بعد خوش کرنا بھی ضروری سمجھتے تھے، سبق کا کچھ حصّہ ختم کرنے کے بعد فرمانے لگے۔

لڑکو! فرض کرو جامعہ کا کام نہیں چلتا، ہم لوگ سرکاری مدرسوں

میں واپس جانے سے تو رہے، تو پھر ہم آخر آ گئے کریں گے کیا، بہتر تو یہی ہے کہ دکانیں کھول لیں، مدہولی کی دکان تو طے ہو گئی — عابد (مولانا شوکت علی کے لڑکے) لیڈر کا لڑکا ہے، یہ لیڈر ہی بنے گا، بشیر پہلوانی کے لیے موزوں ہے، اپنا اکھاڑہ جمائے گا۔ سمیع (حیدرآبادی طالب علم) اورنگ آباد کا جامہ دار اور ہمرو بیچے گا، اس طرح ادھ لڑکوں کا نام لیا، آخر میں فرمانے لگے۔

" ہم (یعنی خود ماسٹر صاحب) مدہولی کی دُکان پر دُودھ پیا کریں گے، اور کیا ایک بوڑھے کی گذر تو ہو ہی جائے گی۔"

اس پر سب لڑکے ہنس پڑے، میں بھی مسکرا دیا۔

غالباً اسی زمانے میں، گاندھی جی نے "خاموش" روزہ شروع کیا تھا، گاندھی جی ہفتہ میں ایک دن چوبیس گھنٹے کے لیے بالکل خاموش رہتے تھے، کسی سے بات چیت نہیں کرتے تھے، اگر ضرورت ہو تو کسی پرزے پر لکھ کر یا اشارے سے اپنا مطلب سمجھاتے تھے، ایسا کرنے کا مقصد یہ تھا کہ چھ دن متواتر کام کرنے کے بعد ایک دن مکمل آرام کا موقع مل جائے، مجھے بھی ایسا روزہ رکھنے کا شوق ہوا، جماعت کی پڑھائی اور جمعرات کے جلسے ضروری تھے، اس لیے یہ روزہ جمعہ کی صبح کی نماز سے لے کر سنیچر کی صبح کی نماز تک رکھا کرتا تھا۔ کیلاٹ صاحب

(اتالیق) کو علم نہیں تھا، اس روزہ میں ایک دن وہ مجھ سے باتیں کرنے لگے، میں اشارے سے جواب دیتا رہا۔ وہ سمجھے مجھ سے مذاق کر رہا ہے مارنے کے لیے میری طرف لپکے، میں بھاگا، وہ غصّے سے چلاّئے "پکڑو اس کو" میں نے پیچھا کرنے والے لڑکوں کو اشارے سے بتایا، وہ اس راز سے واقف تھے، انہوں نے روزے کا حال کیلاٹ صاحب کو بتایا۔ اس وقت تو وہ خاموش ہوگئے، ایک اور موقع پر سمجھایا کہ لڑکے ایسا کریں تو مدرسے کے انتظام میں فرق آتا ہے، ممکن ہے اور لڑکے بھی تمہاری نقل کرنے لگیں، میں نے اس دن سے یہ روزہ نہیں رکھا

بزم کمال کی طرف سے "تحریری مقابلہ کا اعلان ہوا۔ مضمون اس بات پر لکھنا تھا کہ " اُردو زبان کس طرح ترقی کرسکتی ہے"۔ مختلف رسالوں کو دیکھ کر خاص طور پر انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالے کے مضامین پڑھ کر میں نے یہ انعامی مضمون لکھا۔ رسالہ جامعہ کے مدیر منصف تھے، انہوں نے نہ صرف میرے مضمون کو " اول انعام " کا مستحق قرار دیا، بلکہ اسے دسمبر ۱۹۲۵ء کے رسالہ جامعہ میں چھاپ بھی دیا۔ انعام میں، میں نے کئی قیمتی کتابیں لیں جو ثانوی چہارم میں کام آنے والی تھیں:

جیسا کہ آپ نے پڑھا ہے مدرسے کے تمام لڑکوں کی طرف سے (خواہ وہ ثانوی کے ہوں یا کالج کے) رسالہ "جوہر" نکلا کرتا تھا۔

اِس منتقلی کی وجہ سے اس کا کام ڈھیلا پڑ گیا تھا، اس کے مدیر محمود صاحب فرمانے لگے: "مدہولی ایک بات مان جاؤ تو بہت اچھا ہے"

میں نے کہا: "فرمائیے۔"

"اگر لوگوں سے مضمون لکھوانے، تصویریں اور کارٹون بنوانے کتابت کرانے اور وقت پر پرچہ شائع کرانے کی ذمہ داری لو تو ہم تم کو "مجلس جوہر" میں رکھ لیں گے اور رسالے کا منیجر یعنی مہتمم بنالیں گے۔"

میں کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ کہنے لگے: "سوچنا کا ہے کا، بھلا یہ تمہارے لیے کوئی مشکل کام ہے!"

میں نے کہا: "محمود صاحب! کام مشکل یوں ہے کہ یہ لکھنے والے بڑے نخرے کرتے ہیں، مجھے اس پر غصہ آتا ہے، ارے بھائی صاحب کہہ دو لکھوگے یا نہیں، چلو قصہ ختم، یہ صبح شام اور آج کل کیسی!

محمود صاحب نے سمجھاتے ہوئے کہا: "یہ لکھنے ہی کا کام ایسا ہے کہ فرمائش کرو تو لوگ وعدہ کرلیتے ہیں، پھر سوچتے ہیں کہ جانے لکھ سکیں گے یا نہیں؟ لکھنے کے لیے وقت بھی ملے گا۔! مواد بھی فراہم ہو جائے گا! یہ اس ششِ و پنج میں رہتے ہیں، تم اِسے نخرہ سمجھ بیٹھے، جاؤ یار تمہاری عقل بھی ایسی ہی ہے"! شاہ مرحوم

(جن کے نام سے تعلیمی مرکز کے چند کمرے بنے ہیں) فیروز (ہم جماعت) بھی بیٹھے ہوئے تھے، تھوڑی دیر تک یہ دلچسپ گفتگو جاری رہی آخر میں نے اس کام کے لیے ہاں کرلی، خدا جھوٹ نہ بلوائے، ایک دو دن کا تو کیا ذکر ہے، پرچے کے شائع ہونے میں چند گھنٹوں کی بھی دیر نہ ہوتی تھی، ہر پیر کو صبح کی حاضری کے وقت اشتہار موجود۔ صرف ایک دن ایسا اشتہار لگانا پڑا کہ "جوہر" آج صبح کی بجائے وقفے میں شائع ہوگا، بات یہ تھی کہ رسالہ پہلے سے شیخ الجامعہ صاحب کو دکھانا ضروری تھا انہوں نے ایک مضمون بدلنے کے لیے فرمایا۔ راتوں رات دوسرا مضمون لکھا گیا اور وہ کہیں جاکر صبح صاف ہوا۔

یہ سال تو تبدیلیوں کا تھا ہی، عبدالمجید خواجہ صاحب دہلی میں جامعہ کا کام چلتا کرکے عبدالعزیز صاحب (بیرسٹر) کو اپنی جگہ شیخ الجامعہ بنا گئے انہوں نے اس کام کو مشکل پاکر اپنی ذمہ داری طاہر، ایس محمدی صاحب کے سپرد کردی، جو ان دنوں انگریزی کے پروفیسر اور بہت باقاعدہ کام کرنے والے آدمی تھے، اس عہدے پر یہ تھوڑے ہی عرصہ رہے لیکن انہوں نے شعبوں میں کام کرنے کی رفتار بڑھادی اور لوگوں کو وقت کا پابند بنایا۔ دوسری طرف فاروقی صاحب کی جگہ عبدالوحید صاحب نگراں مدرسہ مقرر ہوئے، جامعہ کے پرانے طالب علم ذاکرحسین خاں۔ صاحب

۱۹۲۲ء میں جرمنی اسی غرض سے گئے تھے کہ مزید تعلیم حاصل کر کے بہتر خدمت کر سکیں، پہ تین سال کے بعد یعنی فروری ۱۹۲۶ء میں برلن یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی ڈگری لے کر لوٹے اور اپنے ساتھ دو اور دوستوں یعنی ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اور پروفیسر محمد مجیب صاحب کو لائے، انھیں اپنے سب لوگ اپنے بیٹھ گئے، جامعہ میں اِن کے آنے کی خوشی میں جلسے ہوئے سپاس نامے⁽¹⁾ پیش کئے گئے، دعوتیں ہوئیں، بھلا اس موقع پر رسالہ "جوہر" کیوں خاموش رہتا، اس کا خاص نمبر نکالا گیا، جس کے سب مضامین جامعہ کی پچھلی زندگی کے بارے میں تھے، یعنی کس زمانے میں کیا حالات رہے کیا کیا مشکلیں پیش آئیں وغیرہ وغیرہ۔ رسالہ کا مہتمم ہونے کی وجہ سے مجھے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے سامنے جانا پڑا، وہ دفتر کے ایک کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے، میں "جوہر" کا خاص نمبر لے کر پہونچا۔ اس کا پہلا مضمون (جسے مقالہ افتتاحیہ کہتے ہیں) ذرا سخت تھا کیونکہ اس میں بتایا گیا تھا کہ جامعہ کے چلانے والے لوگ بدلتے رہتے ہیں، جامعہ کو پھلتا پھولتا دیکھنے والوں کی خواہش ہے کہ اس کے کام کرنے والے جم کر کام کریں تاکہ جامعہ میں کوئی ایک رنگ جمے، غرض اس قسم کی نکتہ چینی کی باتیں لکھی تھیں، اس مضمون کو انہوں نے غور سے

---

(۱) وہ تحریر جس میں کسی معزز مہمان کے آنے پر شکر گزاری کا اظہار کیا جائے

پڑھا، پھر ایک نظر میں تصویریں بھی دیکھیں۔ فرمانے لگے، "یہ پہلا مضمون کس نے لکھا ہے؟" میں نے نام بتانے میں پس و پیش کیا، کیونکہ طے یہی ہوا تھا کہ اس چیز کو ظاہر نہ کیا جائے، میں نے ڈاکٹر صاحب کے اصرار پر یوں کہنا شروع کیا:

"جوہر نکالنے والی ایک مجلس ہے، اس کا جلسہ ہوا تھا، سب نے تھوڑا تھوڑا لکھا پھر ان سب کو ملا کر ایک مضمون کی شکل دے دی گئی۔"

"یہ تو ہو سکتا ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی رائے بتائے کہ کیا لکھنا چاہیئے، لیکن مقالہ افتتاحیہ(۱) لکھتا ایک ہی شخص ہے" یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب مسکرائے، میں کھسیانا ہو گیا، جی چاہتا تھا، یہاں سے جلدی بھاگ جاؤں، وہ تو یوں خیریت ہوئی کہ انہوں نے اور باتیں چھیڑ دیں۔ کچھ دنوں بعد ڈاکٹر صاحب شیخ الجامعہ ہوئے اور ان کے دو ساتھی استاد بنے، اس وقت دونوں باتوں کی طرف توجہ دینے کی ضرورت تھی ایک تو روپے پیسے کی کمی کو پورا کرنا، دوسرے انتظامی اور تعلیمی امور کو آگے بڑھانا۔ چھٹیاں ہونے والی تھیں، اس لیے ایک وفد تو خواجہ عبدالحیٔ صاحب کی نگرانی میں سی۔پی اور برار کے دورے پر گیا، دوسرے وفد کو خود ڈاکٹر صاحب حیدرآباد لے گئے، ڈاکٹر عابد صاحب کچھ قاعدے

---

(۱) پہلا مضمون، جس میں رسالہ کا مدیر یا ایڈیٹر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔

اور نصاب لیٹے تیار کرنے میں لگ گئے۔

علی گڑھ میں چھٹیاں مئی اور جون میں ہوا کرتی تھیں، لیکن دہلی میں جون جولائی میں ہونے لگیں تاکہ پورا تعلیمی سال دو برابر حصّوں میں تقسیم ہو جائے، ایک تو اگست سے دسمبر کے تیسرے ہفتے تک، دوسرے جاڑے کی مختصر چھٹی کے بعد، اتنے ہی عرصے کے لیے یعنی جنوری کے دوسرے ہفتے سے آخیر مئی تک۔

اپریل میں سالانہ امتحان ہوئے، میٹرک کے امتحان میں میں بھی شریک ہوا۔ نتیجہ نکلا تو انگریزی کے علاوہ باقی سب چیزوں میں کامیاب تھا۔

جہاں تک زبانوں کے سمجھنے کا تعلق ہے، میں ایک چھوڑ آٹھ زبانیں سمجھ لیتا ہوں یعنی اردو، ہندی، فارسی، عربی، انگریزی، مرہٹی، تلنگی، پنجابی اور ان میں سے کئی بول بھی لیتا ہوں، لیکن اچھی طرح لکھنے پڑھنے کی مشق مجھے صرف اپنی مادری زبان اردو میں ہے۔

غرض سال گذر گیا، چھٹیاں ہو گئیں، گرمیوں کی چھٹیوں میں کسی طالب علم کو وظیفہ تو ملتا نہیں، اب مجھے فکر ہوئی کہ دو مہینے کے گذارے کے لیے کوئی کام سوچنا چاہیے۔

اس کا حال لکھنے سے پہلے یہ بات اور بتا دوں کہ سردیوں کی چھٹیوں میں میرے لیے کچھ سیر و تفریح کا ایک موقع نکل آیا تھا۔

کان پور میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا، مکتبہ کی طرف سے فروخت کے لیے کتابیں بھیجی جا رہی تھیں، وہاں جانے کے لیے طالب علموں کی طرف سے میرا انتخاب عمل میں آیا، آزادی کی تحریک اگرچہ کمزور پڑ گئی تھی، لیکن سروجنی نگر (کانگریس کی عارضی بستی) کی چہل پہل اور جلسوں کی کارروائیاں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس تحریک نے ہندوستان کے دلوں میں گھر کر لیا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ اس میں اُتار چڑھاؤ آتے رہے ہیں

کان پور سے واپسی پر سروجنی نگر کا مکمل نقشہ رسالہ جوہر کے لیے تیار کیا اور ایک ہفتہ کی کارروائی اور اس پر تبصرہ اس رسالے میں شائع کر دیا

حافظ صاحب نے ۲۴ اپریل ۱۹۲۶ء سے مدرسہ شبینہ (رات کا مدرسہ) کھول رکھا تھا، چند لڑکے اور ایک استاد کام کرتے تھے، طے ہوا کہ اگر میں اس میں کام کروں تو جیبوں کے خرچ کا انتظام ہو جائے گا پہلی منزل تو یہ تھی کہ دن بھر کام کرنے والے غریب بے پڑھے لوگوں میں شوق پیدا کیا جائے اور انھیں رات کے مدرسہ میں جمع کیا جائے، میں نے گھر گھر جانا شروع کیا، ہر شخص کے ہاں تھوڑی دیر تک بیٹھتا. باتیں کرتا اور انھیں یقین دلاتا کہ پڑھنا ایسا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

روزانہ ایک گھنٹہ پڑھنے سے، سال بھر میں کہانیاں اور اشتہارات وغیرہ وغیرہ پڑھ سکتے ہیں، جو لوگ پہلے سے تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا جانتے تھے وہ جلدی تیار ہو جاتے تھے، ان کی مدد سے نہ جاننے والوں کو تیار کر لیا تھا، اس طرح تعداد بڑھنے لگی، صرف ایک مہینے کے عرصے میں چھوٹے بڑے تین سو آدمی مدرسے میں آنے لگے، کہیں قصے کہانیاں سُنائی جا رہی ہیں تو کہیں اخبار، کسی طرف کتابیں پڑھوائی جا رہی ہیں تو کہیں تصویروں کے ذریعے مفید باتیں سمجھائی جا رہی ہیں۔ ان میں سے بڑی عمر کے لوگوں کو لے کر مدرسہ کی پنچایت بنائی تھی، چھٹی ہونے کے بعد اس کا جلسہ ہوتا تھا۔ پنچایت کے رکن جہاں لوگوں کی تکلیفیں اور شکایتیں ہم تک پہونچا دیتے تھے، وہاں ہماری باتوں کو ان میں پھیلاتے تھے، عام جلسوں کا انتظام بھی تھا، جن میں "جادو کی لالٹین" کے ذریعے مفید باتیں سمجھائی جاتی تھیں، علاقے کے معزز لوگ اور جامعہ کے طالب علم اور استاد بھی شریک ہوتے تھے۔ اس قسم کے جلسوں کا ان لوگوں پر اتنا اچھا اثر ہوا کہ انہوں نے اپنی اندرونی تنظیم کو اور مضبوط کر لیا۔

چاندنی راتوں میں تو لوگ یوں ہی تفریحاً چلے آتے تھے لیکن اندھیری راتوں میں بھی مدرسہ کی کشش باقی رکھنے کے لیے میرے ایک دوست کے کہنے کے مطابق مجھے اپنے "کرتب" دکھانے پڑے، چند ایسے کھیل

سوچ رکھے تھے. جو اندھیرے ہی میں کھیلے جا سکتے ہیں، مثلاً طلبہ کو دو فریقوں میں تقسیم کر کے دو "بیٹریاں" دے دی جاتی تھیں، پہلا فریق کسی دور جگہ جاکر بیٹری دکھاتا تھا، مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اس سمت میں ہیں. دوسرا فریق اپنی بیٹری کی مدد سے ان کو تلاش کرتا تھا- "بیٹری کی مدد سے چھپنے اور تلاش کرنے کا کھیل" بستی کی گلیوں میں کھیلا جاتا تھا، تین سو طالب علموں کی لمبی قطار مدرسے سے روانہ ہوتی تھی، میں بیٹری لے کر کسی اونچی جگہ کھڑا ہو جاتا- اس کی تاکید تھی کہ روشنی ہو تو قطار چلے، ورنہ کھڑی رہے.
اسی طرح سیٹی یعنی "فُر فُر" کے کھیل بھی کھلائے جاتے تھے، جب ہم لوگ جامعہ نگر (دہلی سے آٹھ میل دور) منتقل ہو گئے، اس کے بعد بھی قرول باغ کے تانگے والے، ٹھیلے والے، کارخانوں اور عمارتوں کے مزدور مجھے دور سے دیکھ کر "گبھار صاحب" کے نام سے پکارتے تھے اور بڑی محبت سے پیش آتے تھے، اس وقت سے یہ بات مجھے سچ معلوم ہونے لگی ہے کہ "نیکی سدا بہار پھل دار پیڑ ہے، میں نے ایک دفعہ جو محنت کی تھی اُس کی آج تک قدر ہوتی ہے، یہ کتنا بڑا انعام ہے.
یہ بات تو آپ جانتے ہیں کہ ہم جن لوگوں سے کام لینا چاہیں یا جن کے ساتھ کھیلنا چاہیں، جب تک اُن جیسے نہ بنیں وہ اپنی صحبت میں گھسنے نہیں دیتے، اسی لیے میں نے بے پڑھے اور غریب لوگوں سے
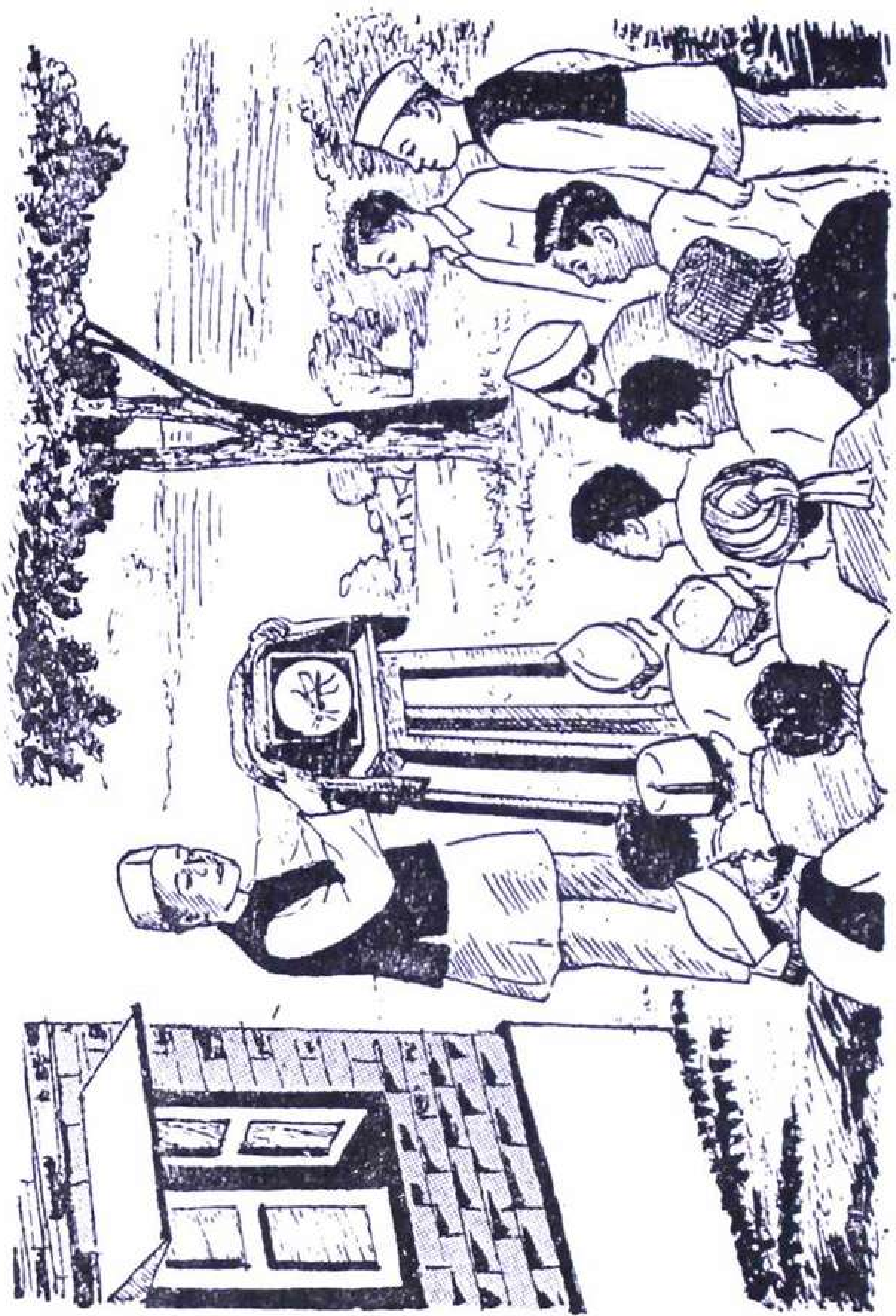
زیادہ سے زیادہ میل جول بڑھایا اور سادگی جو پہلے سے میری طبیعت میں تھی، اسی پر جمارہا: یا دھر تو یہ ہو رہا تھا، اُدھر کیا دیکھتے ہیں کہ میرے بھائی صاحب حیدر آباد سے اچانک دہلی آ گئے، میں نے دل میں کہا:
"الٰہی خیر! معاملہ پھر بگڑتا نظر آتا ہے" دوسرے دن بھائی صاحب مجھ سے کہنے لگے:

"میرے ساتھ چلے چلو، وہاں تمہیں اچھی نوکری مل جائے گی"۔
میں نے کہا: "آپ درست فرماتے ہیں، لیکن جو تجربہ مجھے یہاں ہو رہا ہے اور جو لُطف اس کام میں آتا ہے، وہاں نصیب نہ ہو گا، طالب علمی کا زمانہ میں نے وہاں بھی گذارا ہے، یہ بات وہاں کہاں؟"
یہ بات اُس زمانے کی ہے، جب کہ ہمارے ملک میں پڑھائی کے نئے نئے ڈھنگ ابھی شروع نہیں ہوئے تھے، بھائی صاحب نے مدرسے میں کام تو کیا نہیں تھا، یہ بات ان کی سمجھ میں کیسے آتی؟۔
کہنے لگے:

"میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔"

بھائی صاحب کے سامنے صرف روپے پیسے کا سوال تھا۔
اور میرے سامنے دلچسپ اور غیر دلچسپ کا؟ اس لیے بحث بیکار تھی، مختصر یہ کہ میں نہ مانا، اس پر وہ فرمانے لگے:

"کم سے کم دو باتیں مان جاؤ، ایک تو یہ کہ گھر کی مالی حالت اچھی نہیں ہے، اس لیے یہیں سہی، مگر نوکری کر لو، دوسرے یہ کہ والدہ بہت پریشان ہیں، اُن سے ایک بار ملنے کے لیے میرے ساتھ گھر چلے چلو۔"

دوسری چیز کے سلسلے میں مجھے اندیشہ تھا کہ اس وقت گھر گیا تو وہاں کی نوکری کے لیے رشتہ دار میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔ میں نے بھائی صاحب سے کہا :-

"پہلے میں یہاں کی نوکری پکی کر لوں، تب گھر آؤں گا، والدہ صاحبہ کو اطمینان دلا دیجیے۔" اس پر وہ گھر لوٹ گئے، اور میں اسی سوچ بچار میں پڑ گیا کہ تعلیم جاری رکھوں یا نوکری کر لوں۔

ان دنوں ذاکر صاحب چندہ جمع کرنے کے لیے حیدرآباد گئے ہوئے تھے، عابد صاحب جو یہاں کے انتظامات ٹھیک کر رہے تھے میرے اس کام سے واقف تھے جو مدرسہ شبینہ میں کر رہا تھا، جب انھیں اس گفتگو کا علم ہوا، جو میرے اور بھائی صاحب کے درمیان ہوئی تھی تو ایک دن کہنے لگے : "مجھے آپ کی حالت کا علم ہے، اگر آپ چاہیں تو اپنی تعلیم جاری رکھ سکتے ہیں، وظیفہ مل جائے گا، اگر نوکری کا خیال ہو تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، نئے انتظامات کے سلسلے میں ہمیشہ اُستادوں کی ضرورت ہے، آپ کو رکھ لیا جائے گا، سوچ کر بتا دیجیے۔"

میں نے یہی فیصلہ کیا کہ جامعہ میں استاد کی حیثیت سے کام کروں
ڈاکٹر ذاکر صاحب کے حیدرآباد سے لوٹنے پر جامعہ میں میرا تقرر مدرس
کی حیثیت سے آزمائشی طور پر ہو گیا

جامعہ میں پڑھانے کا آزمائشی کام

مجھے پڑھانے سے دلچسپی تھی، اس لیے میں اس کام سے خوش تھا، جامعہ کی ابتدائی جماعتوں میں اس وقت کلاس ٹیچر سسٹم کا طریقہ نہیں تھا مضمون وار پڑھائی ہوتی تھی، مجھے ابتدائی جماعتوں کا حساب ملا۔

پانچویں جماعت میں آج کل کے نائب ناظم کتب خانہ، نبی احمد صاحب، اکاؤنٹ آفیسر محمد طیب صاحب، حسن مہدی صاحب، اور ان کے ساتھی پڑھتے تھے، ایک دن کا ذکر ہے کہ جماعت میں مجھے کسر کے سلسلے میں $\frac{1}{2}$، $\frac{1}{3}$، $\frac{1}{4}$ وغیرہ سمجھانا تھا، اس دن دو تین سنترے ساتھ لایا اور یوں مخاطب ہوا: "میرے پاس یہ پورا سنترہ ہے، اب ایک طالب علم یہ دیکھے کہ اس میں کتنی پھانکیں ہیں، نبی احمد صاحب نے پھانکیں گنیں دس نکلیں، میں نے کہا: "فرض کرو ایک پھانک نبی احمد کو دے دیتے ہیں' یہ بولے، صاحب فرض کرنے کی کیا بات ہے' دے ہی دیجیے، پھر مجھے خیال آیا کہ فرض کرنے کے بجائے اگر سچ مچ پھانکیں تقسیم کرتا گیا تو پورا سبق سمجھانے سے پہلے ہی سنترہ ختم ہو جائے گا اور پھر تختہ سیاہ اور چاک ہی ہاتھ میں رہ جائے گا۔ میں نے بڑی مشکل سے ان لڑکوں کو

راضی کیا کہ سبق ختم ہونے کا انتظار کریں، اس کے بعد یہ سب پھانکیں برابر تقسیم کردی جائیں گی

طیب صاحب اس وقت تک جماعت میں داخل نہیں ہوئے تھے ایک دن گھنٹہ شروع ہونے سے پہلے میں جماعت میں چلا گیا تھا۔ کچھ لڑکے موجود تھے، گھنٹہ شروع ہونے کے انتظار میں اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں، اتنے میں طیب صاحب نئے نئے داخل ہوئے میری عمر اس وقت ۱۲ سال کی تھی اور دیکھنے میں اور کم معلوم ہوتی تھی، مجھے پہچان نہ سکے کہ میں یہاں کا مدرس ہوں، کہنے لگے:

"اب کون صاحب پڑھانے کے لیے آئیں گے؟"

نبی احمد صاحب بولے

ایک ہیں —— لوگ اُنھیں مدہولی صاحب کہتے ہیں، بس گھنٹہ بجتے ہی داخل ہوں گے

"پڑھاتے کیسا ہیں؟" طیب صاحب بولے

"پڑھائی کا کچھ نہ پوچھو —— سنترے کھلا کھلا کر پڑھاتے ہیں۔

اتنے میں گھنٹہ بجا اور میں تختہ سیاہ کے پاس جھٹ سے کھڑے ہوکر بولا:

جناب آئندہ سے کھانے پینے کی چیز ہرگز جماعت میں نہ لاؤں گا آپ لوگوں کے مُنہ میں پانی بھر آتا ہے اور سبق کی طرف دھیان نہیں رہتا ہے۔

طبیب صاحب چونک پڑے، اب انھیں معلوم ہوا کہ یہ تو ہمارے اُستاد ہیں۔

جہاں تک مجھے یاد ہے، ذاکر صاحب بھی سنترے والے سبق میں موجود تھے، معلوم نہیں انہوں نے اپنے دوست عابد صاحب سے اس کا ذکر کیا یا نہیں، کیوں کہ عابد صاحب جہاں کہیں ایسی بات سُن لیتے ہیں، لطیفہ کہنے کے لیے یاد رکھتے ہیں، اب تک میں بدستور بھائی واحد صاحب کے ساتھ رہتا تھا، جو اب کالج میں پڑھتے تھے جمعرات کی دل چسپیوں میں کالج کے لڑکوں کے ساتھ برابر حصّہ لیتا تھا۔ عام جلسے ختم ہونے کے بعد عبدالوہاب صاحب (سی پی) کے کمرے میں ہمارے ساتھی جمع ہو جاتے تھے، چائے بنانے اور پینے کا ایسا لُطف پھر کبھی نصیب نہ ہوا۔

اپنے ساتھی استادوں سے میل ملاپ بڑھانے کے بعد اب کسی نئے کام کے شروع کرنے کا موقع تھا قدرتی طور پر سب سے پہلے میرا خیال اُس چیز پر گیا، جس سے طبیعت کو لگاؤ تھا، یعنی ڈراما۔ جامعہ میں

اب تک اس کا رواج نہ تھا، ابھی بڑے پیمانے پر شروع کرنا مناسب نہ تھا، سوچا کہ پہلے بچّوں کو مکالمے کی مشق کرائی جائے، رسالہ "پریم" میں ایک مکالمہ "بارش اور بادل" کے نام سے نظر سے گذرا تھا۔ تیسری جماعت کے لڑکوں کو مولوی اسمٰعیل صاحب کی کتاب میں "بادل" کا سبق پڑھایا ہی تھا، اسے جماعت میں اس طرح سُنایا، جیسے سچ مچ دو شخصوں میں بحث ہو رہی ہو، پھر لڑکوں سے کہا کہ تم اسے زبانی یاد کرلو، اور اسی طرح ادا کرو جس طرح میں نے کیا ہے، اگر تم نے اچھی طرح مشق کرلی تو سارے مدرسے والوں کو یہ کام دیکھنے کے لیے دعوت دی جائے گی، لڑکے بہت خوش ہوئے، کام مشکل نہیں تھا، دو تین دن میں یاد کرلیا۔ شیخ الجامعہ صاحب کے اعلان کے مطابق سب لوگ مدرسہ کے آخری گھنٹہ میں ہال میں جمع ہوئے، ایک سرے پر میز اور چند چیزیں تجربہ کرنے کے لیے رکھی گئیں، یہ سوال کہ بادل کیسے بنتے ہیں اور بارش کیوں کر ہوتی ہے، لڑکوں نے اس طرح سمجھایا! جیسے کوئی سائنس کا ماسٹر چیزیں دکھا دکھا کر سمجھاتا ہے، درمیان میں ہنسنے ہنسانے کی باتیں بھی ہو جاتی تھیں، اس سے لڑکوں کے حوصلے بڑھے، وہ میرے سر ہوگئے کہ ایسی ہی نئی نئی باتیں کروائیے، میں چاہتا بھی یہی تھا، اس وقت تک ہمارے ملک میں لڑکوں کے لئے ڈرامہ

چار ہی ڈرامے لکھے گئے تھے، ڈراما کہتے ایسی چیز کو ہیں جو واقعات کسی کہانی میں بیان کئے گئے ہیں، انھیں اس طرح دکھایا جاتا ہے، جیسے ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہے ہوں۔ بچوں کے ڈراموں میں اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ واقعات دلچسپ ہوں اور اس کا مفید نتیجہ نکلے، سوچا کہ بہت سی دلچسپ باتیں اقامت گاہ میں ہوتی رہتی ہیں، کیوں نہ انھیں کا ڈراما تیار کریں، چنانچہ پہلی دفعہ "کاہل طالب علم" کے نام سے ایک ڈراما لکھا (۱)، اس کے کھیلتے وقت اقامت گاہ، کھیل کا میدان۔ جماعت کا کام دکھانے کے لیے سامان لگانا پڑتا تھا، سین کی تبدیلی کے وقت پردے کی ضرورت تھی، یہ کام چادروں سے لیا گیا، اس ڈرامے میں استاد صاحب (اتالیق) کیلاٹ صاحب (ورزش کرانے والے) کریم اللہ صاحب (پڑھانے والے) کی نقل لڑکوں نے ایسی اتاری کی لوگ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ

---

(۱) جب ڈراما "کاہل طالب علم" کے نام سے شائع ہوا تو میرے ایک ساتھی نے بتایا کہ ایسے ڈراموں میں یہ بھی بتانا چاہیئے کہ لڑکے میں یہ عیب کیوں پیدا ہوا، پھر اس طالب علم کی خوبیوں کو بھی ظاہر کرنا چاہیئے، چونکہ اس ڈرامے میں یہ باتیں نہیں تھیں اس لئے میں نے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع نہیں کیا، آگے چل کر بچوں کے لئے جو ڈرامے لکھے اُن میں ان باتوں کا خیال رکھا ہے، جیسے "جھوٹا لڑکا" "غیر ذمہ دار لڑکا" اور "جلدی کی عادت" وغیرہ یہ نفسیاتی ڈرامے ریڈیو پر بھی کھیلے گئے ہیں

ہو گئے، تاہم گنج کے سراج نے "کاہل طالب علم" کا کام اتنی اچھی طرح کیا
کہ کاہلی کی جیتی جاگتی تصویر آ گئی، کام نیا تھا اور دلچسپ، ہر طرف سے
لڑکوں کے تقاضے شروع ہوئے کہ اور ہونا چاہیئے، میں بھی باتوں میں آ گیا
تھوڑے ہی دنوں میں ایک ڈراما " ریاضی داں طالب علم" کے نام سے
کھیلا گیا، مگر اس میں کوئی خاص لطف نہ تھا، اس لیے شائع بھی نہیں کیا۔
میں نے لڑکوں سے کہا: "جانتے ہو، ڈراما پھس پھسا کیوں رہا۔ یہ کام اتنا
سہل نہیں ہے، جتنا تم سمجھ رہے ہو، اچھا ڈراما لکھنے کے لیے بڑی محنت
کی ضرورت ہے، پھر تم نے دیکھا کہ اس کی تیاری میں کتنا وقت خرچ ہوتا ہے
تمہارے لیے یہی ایک کام تو ہے نہیں، اور کاموں کا بھی خیال رکھنا
ہے، تم لوگ ایک عرصے تک اور کام دل لگا کر کرو، میں اس بیچ میں
ایک اچھا سا ڈراما جو پہلے ڈرامے سے بہتر ہو تیار کر لوں گا، لڑکوں کی
سمجھ میں بات آ گئی، اور میں ایک نیا ڈراما لکھنے کی فکر میں رہا، یہ خیال
بھی رہا کہ اب کی دفعہ ایسا کھیل تیار کرنا چاہیئے جسے دیکھنے کے لیے باہر
کے لوگوں کو بھی دعوت دی جا سکے۔

گاندھی جی کا کہنا تھا کہ لڑکوں کو تعلیمی کاموں میں لگا رہنا چاہیئے لیکن
ملک کی آزادی کی کوشش میں ضرورت پڑے تو بڑے لڑکوں کو اپنے
بزرگوں کا ساتھ دینے کے لیے باہر نکل آنا چاہیئے، اس بات کو دکھانے

کے لیے ڈراما "قوم پرست طالب علم" لکھا اور ہفتہ میں دو دن کے حساب سے ایک مہینے تک تیاری ہوئی، دیکھنے والے بہت سے لوگ تھے، ہال ناکافی تھا، میدان میں کرنے کے لیے کئی پردوں کی ضرورت تھی، ایسے کاموں کا سارا خرچ مدرسہ برداشت کرے تو خرچ بڑھ جاتا ہے، لڑکوں نے خوشی خوشی چندہ اکٹھا کیا، کچھ مدد جامعہ نے بھی دی، عید قریب تھی، اس سے بہتر دن اور کون سا ہو سکتا تھا، کھلے میدان میں جامعہ کے تمام لوگ اور مہمان بیٹھے ہوئے تھے ان سب کے بیچوں بیچ مولانا محمد علی تشریف رکھتے تھے، سب سے پہلے لڑکیں نے قومی ترانا گایا، پھر ایک بڑے طالب علم کے واقعات دکھائے گئے کہ اس نے قومی جلسے میں حصہ لیا، گرفتار ہوا، مولانا حسرت موہانی کی طرح جیل میں چکی پیسی، رہائی ہوئی تو مدرسے کے لڑکوں نے بڑی دھوم دھام سے اس کی دعوت کی، پھر اسی لڑکے نے (جو مسلمان تھا) بڑے ہو کر ایک ہندو کے گھر بار کی حفاظت کے لیے اپنی جان کو خطرے میں ڈالا۔ مولانا محمد علی یہ دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ بیچ بیچ میں بلند آواز کے ساتھ کچھ تبصرہ بھی کرتے جاتے تھے، کیونکہ اس طرح کی باتیں ان پر بیت چکی تھیں، کہتے تھے کہ یہ لڑکے تو میری نقل کر رہے ہیں، اس سے لوگوں میں اور دل چسپی بڑھ گئی، اس ڈرامے میں لکھنو کے عرفان نے قوم پرست طالب علم کا اور سی پی کے رفیق نے ڈاکو کا کام اچھا کیا تھا، تقی احمد صاحب نے

مولانا شوکت علی کی نقل کی تھی، ان کا جسم بھاری بھرکم تھا، تھوڑے سے میک اپ کے بعد عین بین شوکت صاحب معلوم ہوتے تھے، اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہیں لوگ ان کی ہیئت ہی کو دیکھ کر ہنسنے لگے

اس موقع پر جی چاہتا ہے کہ میں خاص طور پر ان لڑکوں کا ذکر کروں جو اداکار کی حیثیت سے تماشہ دیکھنے والوں کے سامنے نہیں آتے تھے لیکن پردے کے پیچھے خاموشی سے اسٹیج تیار کرنے، سامان مہیا کرنے اور سجانے کا کام کرتے تھے، دولھا بننا آسان ہے، لیکن دولھا بنانا مشکل ہے، یہ لڑکے کئی دن پہلے سے جان توڑ محنت کر کے سب سامان اپنے ہاتھ سے تیار کرتے، بہت سا سامان ادھر اُدھر سے لاکر اکٹھا کرتے، آخری ریہرسل اور کھیل کے دن صبح سے شام تک اسٹیج بناتے اور سجاتے ...، پھر تماشہ ختم ہونے کے بعد سب لڑکے تو اپنے اپنے کمروں میں جاکر چین سے سوتے، ان لوگوں کو یہ فکر لگی رہتی کہ دوسرے دن سویرے اُٹھ کر اور سب چیزوں کو بٹور کر، جہاں سے لائے تھے وہاں پہونچانا ہے، اس کام میں یوں تو مختلف اوقات میں بہت سے لڑکوں نے حصّہ لیا لیکن میں بہار کے سراج الحق، ضیاء الحق، پنجاب کے عبدالخالق، اور ان کے ساتھیوں کو کبھی نہ بھولوں گا، جنہوں نے ابتدائی زمانے میں جب کہ اس کام کا چلانا مشکل تھا، بڑی مدد دی۔

اسی زمانے میں ایک دن کی بات ہے کہ کسی لڑکے نے مجھ سے پوچھا :-

" ماسٹر صاحب یہ سب کچھ تو ہو رہا ہے لیکن جس طرح بڑوں کے ڈرامے میں عورتوں کا " پارٹ " (کام) ہوتا ہے، اس طرح ہمارے ڈراموں میں لڑکیوں کا کام نہیں ہوتا ہے ، یہ کیا بات ہے ؟"

میں نے جواب دیا :

" ہمارے مدرسے میں لڑکیاں نہیں پڑھتیں اس لیے ان کا کام نہیں رکھا گیا ۔

" تو کیا ہوا، ہمارے یہاں کئی لڑکے ایسے ہیں جو لڑکیوں کی نقل کر سکتے ہیں، ایک لڑکے نے جواب دیا۔

" یہ ٹھیک ہے، لیکن مردوں کی نقل مرد اور عورتوں کی نقل عورتیں ہی کریں تو اچھا معلوم ہوتا ہے ، ہمارے یہاں جب لڑکیاں پڑھنے لگیں گی تو اس کا بھی خیال رکھا جائے گا اور دیکھو ہم نے اب تک جتنے ڈرامے کھیلے ہیں عورتوں کے کام کے بغیر اچھے رہے ، ہر ایک ڈرامے میں عورتوں کا کام ہونا لازمی نہیں ہے ۔

لڑکوں کی سمجھ میں بات آگئی اور پھر انہوں نے یہ سوال نہیں اٹھایا۔
تھوڑے دنوں بعد میں بیمار ہو کر طبیہ کالج چلا گیا، ڈاکٹر ظفریاب

صاحب ہاؤس سرجن تھے، یہاں بھی وہی پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ دیکھا
صبح صبح لڑکے عملی کام سیکھنے کے لیے آتے تھے، ڈاکٹر صاحب انھیں مریضوں
کے پاس لے جاکر سمجھاتے تھے کہ بیماری کس طرح پیدا ہوتی ہے، کیوں کر
پہچانی جاتی ہے اور ریکارڈ کس طرح رکھا جاتا ہے، طب کے مدرسے میں
چھان بین کی خاص ضرورت ہے۔ ڈاکٹر صاحب آدھی رات کو بھی مریضوں
کے کمروں کا چکّر لگاتے تھے، اس سے مجھے بڑی تسلّی ہوتی تھی، مریضو
کے ساتھ ان کا ہمدردی اور محبّت کا برتاؤ، وقت کی پابندی، متعدی
سے اور دل لگاکر کام کرنا، ہنسی مذاق کی باتیں کرنا، ان سب چیزوں سے
شفاخانہ جیسی اداس جگہ میں بھی زندہ دلی نظر آتی تھی، انھیں چیزوں کا اثر لے کر میں نے
یہاں بھی ایک ڈراما لکھا "طب کی دُنیا" ڈاکٹر صاحب نے سب کام کرنے والوں کو سُنایا
اس میں مقامی باتیں زیادہ تھیں، اس لیے میں نے اسے شائع نہیں کیا، لیکن
پھر بھی اس سے دو فائدے حاصل ہوئے، ایک تو میرا وقت دلچسپی سے گذرا، دوسرے
ہسپتال میں کام کرنے والوں کو اپنے کام کے بارے میں سوچنے کا موقع ملا۔

جامعہ کو چلانے کے لیے جو پرانے قاعدے قانون بنے ہوئے تھے
وہ دوبارہ اس طرح ترتیب دیئے گئے کہ ہر کام کے چلانے کے لیے باقاعدہ
ایک کمیٹی بنائی گئی، سب سے بڑی جماعت کا نام "مجلسِ اُمنا" رکھا گیا۔
اس میں ایک خاص بات یہ بھی رکھی گئی کہ اس کے زیادہ رُکن جامعہ کے

اُستاد ہی رہیں، یعنی وہ اُستاد جو دو باتوں کا وعدہ کریں، ایک تو یہ کہ کم سے کم بیس سال یا جب تک زندہ رہیں جامعہ کی خدمت کریں گے، دوسرے یہ کہ ڈیڑھ سو روپے مہینے سے زیادہ تنخواہ نہیں لیں گے۔ یہ بات ۱۹۲۸ء کی ہے کہنے کو تو گیارہ اُستادوں[1] نے یہ عہد نامہ لکھا مگر عملاً سب اُستاد اسی کے مطابق کام کرنے لگے اول تو تنخواہیں پہلے ہی کم تھیں، اب پھر ہر ایک نے اپنی تنخواہ اور کم کروائی ڈیڑھ سو روپے سے زیادہ جن کی تنخواہیں تھیں وہ سو لینے لگے سو والوں نے بھی پانچ پانچ دس دس روپے کم کرالئے ہیں تے تھی تیس کے بجائے پچیس کرالئے۔

تنخواہیں کم کرانے اور کارکنوں سے عہد لینے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ جامعہ مقروض ہوگئی تھی، حکیم اجمل خاں صاحب کے انتقال کے بعد قرض بڑھتا جارہا تھا۔ سابق مجلس اُمنا کے اراکین بے تعلق ہوگئے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں نے یہ ترکیب سوچی کہ جامعہ کے کارکنوں میں سے ایک جماعت ایسی تیار کریں جو جامعہ کو چلانے کی ذمہ داری لے پہلے تو اس جماعت کے اراکین اپنی تنخواہیں کم کرالیں ساتھیوں سے بھی درخواست کریں پھر قوم سے کہا جائے کہ باہمت لوگوں کی جماعت نے جامعہ کو چلانے کی ذمہ داری لی ہے، اس ذمہ داری میں وہ بھی شریک ہوجائے۔ اس مطلب کے لئے آگے چل کر شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی کے انتظام میں شعبۂ ہمدردانِ جامعہ قائم کیا گیا جس نے

---

(۱) ان کارکنوں کے نام یہ ہیں (۱) ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب (۲) پروفیسر محمد مجیب صاحب (۳) مولانا اسلم جیراجپوری صاحب (۴) خواجہ عبدالحی فاروقی صاحب (۵) حافظ فیاض احمد صاحب (۶) ارشاد الحق صاحب (۷) برکت علی صاحب (۸) سعدالدین انصاری صاحب (۹) سعید انصاری صاحب (۱۰) شفیق الرحمٰن صاحب (۱۱) حامد علی خاں صاحب

ماہوار چندہ دینے والوں کی ایک جماعت پیدا کر لی۔ یوں جامعہ کا کام مستقل بنیاد پر چلنے لگا

جس وقت نئے قواعد ضوابط بن رہے تھے، میں کشمیر میں تھا۔ محمود صاحب، نیازی صاحب اور چند لڑکے بھی وہیں تھے، کسی نے مشہور کر دیا کہ جامعہ نے نئے قواعد و ضوابط بنانے میں سرکاری امداد قبول کرنے کی گنجائش رکھی ہے، میں نے اسی وقت شیخ الجامعہ کو تار دے کر پوچھا کہ یہ خبر کہاں تک سچ ہے، بعد میں معلوم ہوا کہ یہ محض افواہ تھی۔

جب کوئی نیا کام کرنا ہو تو بہت سے لوگوں کا جی چاہتا ہے کہ اس میں حصہ لیں، مگر ضرورت اس کی ہوتی ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ ہمت کر کے اسے شروع کر دے اور ان غلطیوں کی جو ابتدا میں ہو جایا کرتی ہیں ذمہ داری اپنے سر لے لے، پچھلے سال ڈراموں کی ابتدا کرنے اور ان کو چلانے کے لیے مجھے ہر طرح کی دقتیں سہنی پڑیں، کوئی کہتا نوٹنکی کی طرح دو ایک نقل دکھا کر ہر طرف سے برا بھلا سنے گا تو اپنے آپ ہمت ہار کر بیٹھ رہے گا، بعض لوگ یہ سمجھتے کہ ڈراما لڑکوں اور عورتوں کے بغیر کھیلا ہی نہیں جا سکتا ہے، بعض کا یہ خیال تھا کہ اس سے پڑھائی میں حرج ہو گا، کوئی کہتا ہندوستان میں ڈرامے کا ہنر جاننے والے بہت کم لوگ ہیں، اس ہنر کو سیکھے بغیر کام کی ابتدا نہ کرنی چاہیے غرض

جتنے مُنہ اتنی باتیں۔ میں ان سب کے جواب میں یہی کہتا: "بھائی یہ سب کچھ درست ہے، مگر مجھے ایک سال اس کام کو کر لینے دیجئے، سال ختم ہونے کے بعد جیسی صورت ہوگی دیکھا جائے گا، جب کام شروع ہوا تو غلطیاں بے شک ہوئیں، مگر مخلص دوستوں نے ان کی اصلاح کی کوشش کی اور رفتہ رفتہ اچھا خاصا کام ہونے لگا۔

ڈراموں کی دلچسپی صرف مدرسے تک نہ رہی بلکہ کالج کے طلبا میں بھی اس کا شوق پیدا ہو گیا اور تو اور استادوں نے بھی ایک ڈراما کھیلا، میں اس وقت کالج کے لڑکوں کے ساتھ ہی رہتا تھا، جن میں انور خاں صاحب (مدراس) محمد حسین صاحب (حیدرآباد) عبدالجلیل صاحب ندوی، امتیاز حسین صاحب (قائم گنج) حسین حسان صاحب، عبدالواحد صاحب سندھی عبدالکریم صاحب (پشاور) عبدالوہاب صاحب (سی، پی) اور عزیز اللہ بیگ (سی، پی) ذکر کے قابل ہیں، ایک دن کی بات ہے کہ سارے لڑکے ایک کمرے میں جمع تھے، امتیاز صاحب نے کہا:

ماسٹر صاحب ہو جائے، ایک ڈراما" مطلب یہ تھا کہ کالج کے لڑکوں سے بھی ڈراما کروائیے۔

میں نے کہا: "بڑے لڑکوں کے لیے ایسا ڈراما نہیں ملتا، جس میں عورتوں کا پارٹ نہ ہو۔"

تو کیا ہوا، موجودہ ڈراموں میں سے کسی میں اس طرح ردوبدل کیجئے جس سے ہمارا کام بن جائے۔ عبدالکریم صاحب پشاوری نے کہا:
اس وقت کالج کے لڑکوں کے لیے خاص طور پر ڈرامے لکھے نہیں گئے تھے، بعد میں حیدرآباد (دکن) کے بعض استادوں اور محمد مجیب صاحب (شیخ الجامعہ) نے کئی ڈرامے اس طرح کے لکھے ہیں، جن میں عورتوں کا پارٹ نہیں ہے، میں اس وقت اور کیا کرتا، آغا حشر کے ایک ڈرامے میں تبدیلی کر کے لڑکوں کے سامنے رکھ دیا، پارٹ تقسیم ہوئے، چھوٹے بچوں کے مقابلہ میں ان لوگوں کو سکھانے میں زیادہ دشواری پیش آئی، کوئی شرماتا، کوئی کہتا آپ بتاتے جائیے اس وقت تو یوں ہی سرسری طور پر سنائے دیتا ہوں، اصل کام اسٹیج پر دکھا دوں گا، ایک صاحب فرماتے میرا کام ہی کتنا ہے، اوروں سے مشق کروائیے، کوئی تھیٹر کی نقل میں زور زور سے بولتا تو کوئی ایسے منہ میں زبان ہی نہیں ہے، بڑی مشکلوں سے یہ لوگ قابو میں آئے، ڈراما تو جیسا کچھ بھی ہوا ہو، اس سین میں ڈراما آیا جب "پیام تعلیم" کے مدیر حسین حسان صاحب بغل میں اخباروں کا بلندہ لئے عینک میں سے گھورتے ہوئے عدالت میں داخل ہوئے، ان کا پارٹ یہ تھا کہ یہ "پیسہ اخبار" کے مدیر ہیں اور انھیں ایک مقدمہ میں گواہی دینی ہے، انھیں سکھانے کی ضرورت نہیں پڑی کہ یہ حضرت سچ مچ بنے بنائے

ایڈیٹر تھے، کام تقسیم کرتے وقت طبیعت کی مناسبت کا خیال رکھا جائے تو بہت سہولت رہتی ہے اور ایکٹنگ میں اصلیت کا رنگ آجاتا ہے۔

حیدر آباد کے ایک مشہور قوال تھے علی بخش، لوگ انھیں واعظ قوال کہتے تھے، ان کی خصوصیت یہ تھی کہ ایک ہی مضمون کے فارسی، اُردو، ہندی کے شعر سُناتے، کبھی گاکر، کبھی سادہ انداز میں۔ ایک شعر پڑھتے اور پھر مختلف زبانوں کے اشعار کا جوڑ ملاتے جاتے، آخر تان وہیں آکر ٹوٹتی جہاں سے شروع کیا تھا۔ ان کی نقل میں لڑکوں کے مجمع میں تو خوب کر لیتا تھا، لیکن بڑوں کے تقاضے سے اس ڈرامے کے کھیلنے کے سلسلے میں یہ نقل کرنی پڑی، علی بخش کے پاس ستار ہوتا تھا، میرے پاس ہاکی (اسٹک) تھی، سُر ناک سے نکالتا تھا۔

لوگوں نے کہا، بھئی اب تو استادوں کو بھی کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ ایک سال پہلے پروفیسر وہاج الدین صاحب نے بڑوں کے لیے ایک اچھا سا ڈراما لکھا تھا "نکاح بالجبر" پروفیسر محمد مجیب صاحب نے استادوں کو یہ ڈراما کھیلنے پر راضی کر لیا، خود بھی اس ڈرامے میں کام کیا اور ان کو بھی سکھایا مجیب صاحب اداکاروں کے سجانے (میک اپ) میں کمال رکھتے ہیں اداکاروں کا انتخاب بھی بہت اچھا تھا۔ ڈراما غیر معمولی طور پر کامیاب رہا۔ پچھلے سال یہ کام جو ہوا تو پہلے سے کسی سوچے ہوئے پروگرام

کے مطابق نہ تھا اور ہوتا بھی کیسے، جب ایک چیز چل پڑے تب ہی اس کے لیے قاعدے قانون بنانا اچھا معلوم ہوتا ہے، اور کاموں کا حرج نہ ہونے کے خیال سے میں نے اتالیق صاحبان سے مل کر یہ طے کیا کہ ڈرامے سال بھر میں صرف دو ہوں گے، ایک "یوم تاسیس" پر اور دوسرا "عید" کو، چنانچہ اس سال بچوں نے صرف انھیں دو موقعوں پر ڈرامے کھیلے، یہ بیچ میں کالج کے طلبا اور استادوں کے ڈراموں کا ذکر نکل آیا تھا، آیئے اب لڑکوں کے ڈراموں کی طرف آئیں۔

بہت چھوٹے بچے یعنی تیسری اور چوتھی جماعت والوں نے کہا کہ ایک ڈراما ایسا بھی کروائیے جس میں صرف ہم ہی ہوں۔

اس مطلب کے لیے غلام عباس صاحب کا لکھا ہوا ڈراما "ثریا کی گڑیا" بہت موزوں تھا، اس میں کام کرنے والے دو بچیاں اور ایک بچہ ہے، ایک بچی جس کی عمر سات سال کی ہوگی، اپنی سہیلی کو گڑیوں کا گھر دکھانے کے لیے چائے پر بلاتی ہے، اس کا چھوٹا بھائی (عمر چھ سال) دعوت کی چیزیں ہضم کرنے کے لیے اسے طرح طرح سے پریشان کرتا ہے، اسی دوران میں، بہن کو ایک ترکیب سوجھتی ہے، وہ بھائی کو کل پرزوں کے ذریعے چلنے والی گڑیا بنا دیتی ہے، سہیلی کے آنے پر یہ زندہ گڑیا طرح طرح کے کھیل تماشے دکھاتی ہے، چائے کا سامان، گڑیوں کا پٹارہ، ایک

پردہ اور صرف تین بچوں کے ذریعے یہ تمثیل نہ صرف مدرسے بلکہ گھروں میں بھی آسانی سے کھیلی جا سکتی ہے، زبان میں مٹھاس ہے، چھوٹے چھوٹے جملے ہیں، اس عمر میں بچے جس طرح اپنی بھولی بھالی ادائیں دکھاتے ہیں، اسی انداز میں لکھا ہے۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ نری گفتگو ہی نہیں ہے، اداکار کچھ نہ کچھ کرتے ہوئے بولتے ہیں، اس لیے اور بھی لطف آتا ہے میں ہر سال کسی نہ کسی جماعت میں اسے سُناتا ہوں، سننے اور سنانے والوں میں سے کوئی بھی نہیں اُکتاتا۔ ان بچوں کو جو ڈراما کا مطلب اور اس کے کھیلنے کا طریقہ نہ جانتے ہوں، اگر کوئی یہ ڈراما ٹھیک سے پڑھ کر سُنائے تو نہ صرف بات ان کی سمجھ میں آجائے گی، بلکہ ان کا جی چاہے گا کہ اسے کھیل ہی لیں، جامعہ میں اس وقت چھوٹی بچیاں نہیں پڑھتی تھیں، اس لیے میں نے یہ ڈراما "سہیلیوں" کی جگہ "دوست" فرض کرکے تاسیس کے موقع پر کرایا تھا، گڑیوں کا کھیل چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں سبھی کھیلتے ہیں اس لیے اس تبدیلی کا کوئی پتہ نہ چلا۔ میاں مسعود (جو اب عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں) زندہ گڑیا بنے تھے، نگینہ کے شاہد مسعود کے بڑے بھائی اور قائم کنج کے شفیق، شاہد کے دوست بنے تھے

اس ڈرامے میں اس وقت بڑا ہی مزا آیا جب مسعود کے بھائی نے ان کے چہرے پر رنگ کے نشان لگا، گڑیا کا لباس پہنا کر

پردے کے پیچھے چھپا دیا تاکہ آنے والے مہمان کے سامنے گڑیا کے طور پر پیش کر سکے، دوست نے دروازہ کھٹکھٹایا اس پر مسعود پردے کے پیچھے سے بولے:

"یہ نہیں میرے بس کی بات، مجھے بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔"

مسعود کے بھائی نے کہا:

"نادیدے کہیں کے، مہمان آ رہے ہیں، ذرا دیر کے لیے چپ ہو جاؤ، اچھا نکالو باہر اپنا ہاتھ۔"

مسعود نے اپنا ہاتھ باہر کیا، بھائی نے ہتھیلی پر بتاشے رکھ دیئے تب جا کر یہ خاموش ہوئے۔

دوسرا ڈراما "اسکول کی زندگی" عید کے موقع پر کھیلا گیا تھا، میں جس وقت میٹرک میں پڑھ رہا تھا (Nagnathan at School) نامی ایک کتاب نصاب میں تھی، اسی کے پلاٹ سے یہ ڈراما تیار کیا تھا۔ بھولے ناگناتھن کا کام عرفان نے، دو شریر لڑکوں کا کام قائم گنج کے سراج اور سعید انصاری صاحب کے بھائی شعیب نے کیا تھا، طیب صاحب نے کیلاٹ صاحب کی، بنی احمد صاحب نے ڈاکیہ کی نقل خوب اتاری تھی۔

ڈراموں کا یہ کام پرانا ہوتا جا رہا تھا، میں نے سوچا کہ اب کسی نئی

چیز کی طرف توجہ کرنی چاہیئے، اس دفعہ پڑھنے پڑھانے کے طریقوں کی طرف دھیان دینا شروع کیا، یہ چیز مجھے پسند نہ آئی کہ ایک اُستاد مختلف جماعتوں کو پڑھا رہا ہے، کسی کلاس کو اُردو، کسی کو حساب، کہیں تاریخ تو کہیں جغرافیہ، گھنٹہ بجتے ہی ایک صاحب سر پر سوار ہیں، کیوں صاحب! اس لیے کہ گھنٹہ بج گیا ہے، جماعت خالی کر دیجئے، اب سوچیے کہ ایک کام میں دل چسپی بڑھ گئی ہے، لڑکے اور استاد دونوں چاہتے ہیں کہ یہی کام جاری رہے، مگر اس انتظام میں سارا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے، میں نے شیخ الجامعہ صاحب کو درخواست دی کہ میرے ذمے صرف ایک جماعت کے سارے گھنٹے کر دیجیے، یہ بھی خیال تھا کہ اس تجربے کو پہلی جماعت سے شروع کروں، مجھے یہ جماعت مل گئی، بڑی خوشی ہوئی کہ اب گھنٹوں کا جھگڑا جاتا رہے گا، کام کرتے کرتے تھک جائیں گے تو تھوڑی دیر سیر کر لیا کریں گے، ایک درخواست اس مطلب کی بھی دی کہ استادوں کی انجمن میں پڑھانے کے طریقوں پر بات چیت ہوا کرے اور باری باری سے ہر ایک استاد نمونے کے سبق پڑھا کر دکھائے، ذاکر صاحب نے سوچا کہ اس کا شوق تو رُکے گا نہیں، معلوم نہیں یہ استادوں کی انجمن میں بقول اکبر صاحب مرحوم کیا کیا "گڑبڑ" کرے، اس کام کے لیے کچھ اور لائق ہونے کی ضرورت ہے، انہوں نے دو باتوں کا انتظام کر دیا، ایک تو

مجھے فوراً ہی ایک اقامت گاہ (شوکت منزل، جس کے ایک اتالیق، پہلے ہی سے اختر حسین صاحب تھے۔) کا اتالیق بنا دیا، دوسرے پڑھانے کے طریقوں کی نئی نئی باتیں معلوم کرنے کے لیے موگا بھیجنے کا انتظام کر دیا۔

میرا بچوں کو نئے نئے انداز میں پڑھانے کا اور ڈرامے کروانے کا یہ رنگ دیکھ کر مجلس تعلیمی نے فیصلہ کیا کہ مجھے پڑھانے کے طریقوں کی ٹریننگ دلانے کے لیے موگا (پنجاب) بھیج دیں۔ اس جگہ کا انتخاب اس لیے کیا گیا کہ یہاں پروجکٹ میتھڈ کی خاص طور پر ٹریننگ دی جاتی تھی۔

نارمل اسکول موگا[1] کی زندگی

ولائت کے مال دار عیسائیوں نے ہندوستان کے عیسائیوں کی تعلیمی حالت بہتر بنانے کے لیے ہندوستان میں کئی مدرسے کھول رکھے تھے، ان میں سے امریکہ کی انجمن (A.P.Mission) کا ایک مدرسہ تحصیل موگا ضلع فیروزپور پنجاب میں تھا۔

ان مدرسوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی، کہ کم سے کم خرچ میں چلائے جاتے تھے اور لڑکوں میں اپنی روزی آپ کما کر تعلیم جاری رکھنے کا شوق پیدا کیا جاتا تھا، اس مقصد کے لیے زیادہ تر کھیتی باڑی سے کام لیتے تھے ہمارے یتیم خانوں کا انتظام کچھ اور ہی ہوتا ہے، لڑکوں کی قطاریں کسی امیر کے یہاں دعوت کھانے یا صدقہ لینے کے لیے جاتی ہوئی سڑکوں پر نظر آتی ہیں، مجھے اس منظر کو دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے، کاش ہم عیسائیوں کے ان مدرسوں سے سبق لیں، جہاں نیچی ذات کے مفلس لڑکوں کو تعلیم دینے کا انتظام ہے، ہمارے یتیم خانوں کے لڑکوں کے چہروں پر ایک افسردگی اور مسکینی کا احساس نظر آتا ہے، مگر ان عیسائی مدرسوں کے لڑکوں کو آپ چاق چوبند خوش و خرم پائیں گے، انھیں کام اور تعلیم

[1] اب یہ لدھیانہ میں منتقل ہو گیا ہے۔

دونوں میں دل چسپی لیتے ہوئے پائیں گے، ان کے ہشاش بشاش چہرے اور چمکدار آنکھوں سے مفلسی کا گمان تک نہ ہوگا۔

موگا میں دو طرح کے لڑکے تعلیم پاتے تھے، ایک تو پہلی جماعت سے آٹھویں جماعت تک کے، دوسرے "بچے اُستاد" یعنی وہ لوگ جو یہ سیکھنا چاہتے ہیں، کہ لڑکوں کو کس طرح پڑھاتے ہیں، اسے "ٹریننگ اسکول" کہتے ہیں۔ جو مدرسے کسی خاص کام کو کر رہے ہوں اور بہت مشہور ہوں، وہ چھوٹے سے نام سے پہچان لیے جاتے ہیں، مثلاً "علی گڈھ کا مدرسہ" "جامعہ" اس طرح یہ مدرسہ "موگا کا مدرسہ" کہلاتا تھا۔

داخلے کے وقت نگراں صاحب مدرسے کے ہر ایک لڑکے کو اپنے قریب بٹھا کر تین باتیں محبت سے سمجھایا کرتے تھے ایک تو ظاہری صفائی، یعنی بدن اور کپڑے صاف رکھنا، دوسرے باطنی صفائی یعنی سچ بولنا، دل میں کپٹ نہ رکھنا وغیرہ، تیسرے کسی کے ڈر سے اپنے دل کی بات نہ چھپانا۔ سمجھاتے وقت تو یہ باتیں اہم معلوم نہیں ہوتیں، لیکن جب مدرسہ اور اقامت گاہ میں انھیں برتنے کے موقعے آتے ہیں تب ان کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے، جب میں موگا پہونچا تو داخلے کے وقت وہاں بھی مسٹر ہارپر (پرنسپل) فرمانے لگے۔

"یہاں سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں —— اگر کچھ حاصل کرنا چاہتے ہو تو ہر چیز میں کوئی نہ کوئی بات نظر آئے گی اور اگر صرف اسی کی فکر ہے کہ کسی طرح سال گذر جائے تو اچھی چیزیں بھی نظر سے چھپی رہیں گی اور زیادہ تر شکایت ہی کرتے سنائی دوگے" پھر کچھ ٹھیر کر فرمایا :

"کام کرتے وقت اس بات کی طرف کبھی کبھی دھیان دینا، اگر ٹھیک معلوم نہ ہو تو ایک دفعہ پھر اس کے بارے میں مجھ سے بات چیت کرنا۔

مسٹر ہارپر لڑکوں کی غلطی کو مار پیٹ کر ٹھیک نہیں کرتے تھے ان کا ڈھنگ ہی سب سے نرالا تھا ، جہاں کوئی غلطی نظر آئی تو یہ سب میں شور کرتے پھریں گے، " لڑکو! لڑکو!! غضب ہو گیا، آؤ ایک عجیب وغریب بات سنو" وہ اس غلطی کو نمک مرچ لگا کر بیان کریں گے، کہانی کی طرح سنائیں گے، ہو سکے تو لطیفہ بنائیں گے، جب لڑکے سننے کو جمع ہوں تو پہلے سوچ میں پڑ جائیں گے، جب سننے والے لڑکے خوشامد کریں گے، تب سنائیں گے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دو تین لڑکے آگے آگے اور یہ پیچھے پیچھے چلے جا رہے تھے ، شامتِ اعمال ان میں سے کسی لڑکے نے کاغذ بکھیر دیئے ، یہ پیچھے سے چلائے :

"سُننا بھائی، سُننا بھائی" جوں ہی لڑکے پیچھے مُڑے، اُنہوں نے جھک کر کاغذ کے دو تین پُرزوں کو پتلون کی جیب میں رکھا اور کہنے لگے

"اوہو میری کمر دُکھ گئی، بڑی مہربانی ہوگی اگر ان پرزوں کو میری جیب میں رکھ دو"

جس لڑکے نے کاغذ گرائے تھے وہ شرمندگی سے چُپ کھڑا تھا، اس کا ساتھی پُرزے چُنتے ہوئے کہنے لگا۔

"صاحب جانے دیجئے، یہ آئندہ سے ایسی غلطی نہیں کریں گے"

مگر خود غلطی کرنے والا چپ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آئندہ بھی ایسا کرے گا

تب اس شرمندہ لڑکے نے آہستہ سے کہا: "نہیں کروں گا"

اس پر مسٹر ہار پر پھر چونک کر بولے:

"دیکھو، دیکھو! یہ کہتے ہیں استاد نے جو کہا ہے وہ نہیں کروں گا"

لڑکے نے جواب دیا: "آئندہ سے کاغذ نہیں گراؤں گا" "یہ بات یاد رکھنے کے لیے کچھ کرنا چاہیئے ورنہ بھول جاؤ گے، تو ہاں، آپ لوگ مہربانی کرکے میرے ساتھ آیئے

ان لڑکوں کو ایسی جگہ لے گئے جہاں بہت سے بکھرے ہوئے کاغذ پڑے ہوئے تھے، پھر اس غلطی کرنے والے لڑکے سے یہ کاغذ

اُٹھوائے، یہ واقعہ اقامت گاہ کا تھا، مدرسے کے وقت اسی جماعت میں آ گئے، جس میں کاغذ بکھیرنے والا لڑکا بیٹھا تھا، کہنے لگے:

"ایک بڑی دلچسپ کہانی ملی ہے"۔ جماعت کے سب لڑکے چونک پڑے، ایک لڑکے نے کہا:

"آپ کی بڑی مہربانی ہوگی، اگر آپ اس کہانی کو یہاں نہ سُنائیں" مسٹر ہارپر مُنہ بناتے ہوئے (ایک آنکھ میچتے ہوئے) وہاں سے بھاگ آتے، سب لڑکوں نے تالیاں بجادیں

یہ بات نہیں تھی کہ صرف لڑکوں کی غلطی پر ہی شور کرتے تھے اچھی باتوں سے خوش ہو کر اُنھیں بھی مدرسہ اور اقامت گاہ میں سُناتے پھرتے تھے

اصل میں سب ہی لڑکے چاہتے ہیں کہ اچھی عادتیں پیدا کریں بس اتنی بات ہے کہ غلطی ہونے پر اگر کوئی شخص اسی وقت ٹھیک سے سمجھادے تو بات دل میں بیٹھ جاتی ہے

مسٹر ہارپر سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا تھا، ابھی دفتر میں ہیں، تھوڑی دیر میں کھیتوں پر پہونچ کر لڑکوں سے گپ شپ کریں گے، پھر جماعت میں آکر کہیں گے:

"آج کھیتوں پر بڑی بہار ہے، کام چھوڑنے کو لڑکوں کا جی نہیں

چاہتا ہے، میں نے کہہ دیا ہے کہ چھٹے گھنٹے میں پانچویں جماعت آئے گی تو کام چھوڑنا ہی پڑے گا۔"

"جی ہاں! بہت ٹھیک کہا، شکریہ" سب لڑکے بول پڑیں گے۔

موگا کے آس پاس چھوٹے چھوٹے مدرسے تھے، ہاربر صاحب کے پاس ایک موٹر تھی جب کسی کام سے ان مدرسوں میں جاتے چار پانچ لڑکوں کو ساتھ بٹھا لیتے، شرط یہ ہوتی کہ لڑکے لوٹ کر اپنی جماعت والوں کو اس کام کے بارے میں کچھ سمجھائیں یا مضمون لکھیں، انھیں گھوم پھر کر کام کرنے کا بہت شوق تھا، کہتے تھے اس سے سستی نہیں آتی، کھاتے بھی بہت تھے، میم صاحبہ گھر پر نہ ہوں تو دوسرے دن کام آنے والی کیک پیسٹری سب کھا جاتے تھے، دریافت کرنے پر کہتے

" آج کام بہت کیا تھا، اس لیے کھا گیا، جس دن کام نہ کروں اس دن بھوکا بھی تو رہتا ہوں۔"

لڑکوں کو یہ دیکھنے میں سیدھے سادے معمولی آدمی معلوم ہوتے تھے، لیکن جب بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ ملتے تھے یا کسی سرکاری کمیٹی میں بولتے تھے یا عام جلسوں میں شریک ہوتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کوئی بہت بڑا عالم جو خاص طور پر تعلیم کا ماہر ہے بول رہا

ہے، جو کچھ کہتے تھے، سنجیدگی، وقار کے ساتھ، اور سوچ سمجھ کر رائے دیتے تھے، لڑکوں کو خوشی ہوتی تھی۔ کہ ہمارے پرنسپل صاحب بحث میں کسی سے پیچھے نہیں رہتے۔

گرجا میں کبھی کبھی وعظ بھی کہا کرتے تھے، ایک دن اتوار کی عبادت میں کہنے لگے:

"مسجدوں میں جمع ہوکر مسلمان جس انتظام کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں وہ مجھے پسند ہے، نگرانی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا ہے، سب لوگ چُپ چاپ مُنہ ہاتھ دھوتے ہیں، جہاں جگہ ملے بیٹھ جاتے ہیں اگر کوئی آگے جانا چاہے تو لوگ خوشی سے راستہ دے دیتے ہیں، ہر شخص اپنے آپ خدا کی تعریف میں کچھ کہتا ہے، پھر ان کا سردار کچھ کہتا ہے، وہ خاموشی سے سنتے ہیں، صف بناتے وقت ہر شخص یہ کوشش کرتا ہے کہ قطار سیدھی رہے، بچے الگ سے کھڑے ہو جاتے ہیں، آپس میں اشارے سے چُپ رہنے کے لیے کہتے ہیں، ان کا سردار جیسا کرتا ہے وہ بھی ویسا ہی کرتے ہیں، پھر اپنی اور لوگوں کی بھلائی کی دعا مانگتے ہیں، یہ سب کچھ دُنیا والوں کے دکھانے کے لیئے نہیں بلکہ دل سے کرتے ہیں، مگر یہ سمجھتے ہوئے کہ کوئی دیکھنے والا ہے، اگر صرف دُنیا والوں کی نظر میں اچھا بننے کے لیے کام کرنے کی عادت ہو تو جہاں کوئی دیکھنے والا

نہ ہو وہاں آدمی بُرائی کرنے میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا، اس لئے اَن دیکھے خدا پر ایمان لاؤ، مگر یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ ہر وقت سب کو دیکھتا ہے اور سب کچھ سُنتا ہے، اس میں ساری دُنیا والوں کی بھلائی ہے۔"

ولایت کے لوگ عام طور پر سورج نکلنے کے بعد سو کر اُٹھتے ہیں، مگر آپ کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ ہارپر صاحب ہر زمانے میں اندھیرے مُنہ بلکہ پو پھٹنے سے پہلے اُٹھ کر مدرسہ کا کام کاج شروع کر دیتے تھے، مجھے ایک مسئلہ پر بات چیت کرنی تھی، کہنے لگے: "آپ تو نماز کے عادی ہوں گے۔"

میں نے کہا: "پڑھ تو لیتا ہوں، مگر صبح کی نماز بہت پابندی سے ادا کرتا ہوں" اس پر بڑے زور سے ہاتھ ملایا، کہنے لگے: "اُسی وقت تشریف لائیے۔"

میں نے تعجب سے پُوچھا:

"کیا آپ جاگتے ہوں گے"؟

کمرے میں جاتے ہوئے جواب دیا: "اس کے بارے میں اُسی وقت بات چیت ہوگی۔"

دوسرے دن میں نے صبح کی نماز معمول سے پہلے پڑھی، ہارپر صاحب کے مکان پر پہونچا، کیا دیکھتا ہوں کمرہ روشن ہے، ہارپر صاحب

دفتری کام کر رہے ہیں، مجھے ایک کرسی پر بٹھا دیا، تھوڑا سا کام اور کیا پھر میری طرف توجہ کی، مسئلہ کیا تھا، وہی پہلی جماعت کے "قاعدہ" والی بات کہ یہاں جو کچھ بتایا جاتا ہے وہ ٹھیک ہے مگر فلاں فلاں باتوں میں مجھے اختلاف ہے، غور سے سُنتے رہے، مجھے ان کی دشواریوں کا علم تھا، اس لیے اپنی بات پر زیادہ زور نہ دیا۔

میں نے آج کی ورزش سے چھٹی لے رکھی تھی، ہم دونوں ٹہلتے ہوئے ادھر پہونچے، کہنے لگے: "دن میں کوئی نہ کوئی مصروفیت نکل آتی ہے، مہمانوں کا آنا، کھیتوں پر لڑکوں کا کام، اُستادوں سے بات چیت، قریب کے مدرسوں کا دورہ، اس لیے اپنا دفتری کام صبح سویرے نبٹا لیتا ہوں، خاموشی ہوتی ہے، تھوڑے وقت میں بہت سارا کام ہو جاتا ہے، بعض لوگ، تفریح میں وقت گذار کر خوش ہوتے ہیں۔ بعض کام نبٹا کر ہم لوگ دوسری چیز کو پسند کرتے ہیں، پھر یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ صبح صبح لڑکے ورزش کے لیے جائیں اور میں سوتا رہوں

ہارپر صاحب جس قسم کا کام کرتے تھے اس کے لیے پابندی وقت کا سوال اہمیت نہیں رکھتا ہے، پھر بھی عادت قائم رکھنے کے لیے ایک چیز میں وقت کی پابندی اپنے لئے لازمی کر لی تھی، یعنی مدرسہ کی حاضری میں لڑکوں کے ساتھ دُعا (ترانہ) میں ضرور شریک ہوتے تھے کہا کرتے تھے

کہ ایک وقت تو ایسا ہو جس میں سب لوگ ایک جگہ جمع ہوں، مدرسہ کے
آداب، مراسم، جلسے، الوداعی دعوتیں، ان سب چیزوں کی قدر و قیمت کو
اچھی طرح جانتے تھے، ایک خاص بات یہ ہے کہ لڑکوں کا کوئی کام خواہ
معمولی ہی کیوں نہ ہو، ان میں اچھی باتیں تلاش کر کے ان کا دل بڑھاتے تھے
وہ کچھ وقت کے لیے ہماری جماعت کو پڑھایا کرتے تھے، تفریح
ختم ہونے کے بعد ہی اپنا گھنٹہ رکھا تھا، پڑھانے میں اس بات پر
بہت زور دیتے تھے کہ بچوں کی باتیں اکثر ٹھیک ہوا کرتی ہیں، اگر کوئی
ان پر دھیان دے تو تعلیم کے کاموں میں بڑی آسانی ہو جائے، ان کے
پڑھانے کا جو خاص اصول ہے وہ میں بتاتا ہوں، اس سے اندازہ ہو جائے
گا کہ انہوں نے بچوں کی حمایت میں جو بات کہی ہے وہ ٹھیک ہے یا
یوں ہی انھیں خوش کرنے کے لیے کہا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جب کوئی
پڑھانے کے لیے جماعت میں جائے تو یہ دیکھے کہ ان دنوں مدرسے میں
کوئی ایسا کام تو نہیں ہو رہا ہے، جسے مدرسے کے سب لڑکے مل کر انجام
دے رہے ہیں، مثلاً میلاد النبی کی تیاریاں، اگر ایسا ہے تو لڑکے
اسی کام کو پسند کریں گے، کیونکہ وہ اس میں اور جماعت والوں سے کسی
سے پیچھے نہیں رہنا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی ایسا مشترک کام نہ ہو تو لڑکے
اس بات کو پسند کریں گے کہ ان کی جماعت کے لیے کوئی ایسا مشغلہ ہو کہ

وہ کوئی چیز بنا کر دکھا سکیں یا بڑوں کے کسی کام کی نقل کر سکیں، مثلاً صابن بنانا روشنائی تیار کرنا، یا ڈاکخانہ کی نقل یا سمندر اور پہاڑوں کے نمونے بنا کر نقلی ریل اور ہوائی جہاز چلانا وغیرہ، یہ سب چیزیں معلومات حاصل کئے بغیر ہونے سے رہیں۔ اس لیے کام کرنے کے شوق میں لڑکے کتابیں پڑھنے لوگوں سے پوچھ گچھ کرنے کو تیار ہو جائیں گے، جو کچھ علم حاصل کریں گے وہ ان کے ذہن نشین ہو جائے گا، ہم لڑکے کو آسانی سے اس پر آمادہ کر سکیں گے کہ وہ معلومات کو اپنی کاپیوں میں نوٹ کرے، ان پر اچھے اچھے مضمون لکھے، بلکہ اپنی حیثیت کے مطابق چھوٹی چھوٹی کتابیں تیار کرے، اس قسم کے کام کا نام "پروجکٹ" رکھا گیا ہے، یعنی کوئی مقصد سامنے رکھ کر کام کرنا، اب آپ ہی کہئے کہ بارپر صاحب کی بات ٹھیک ہے یا نہیں ہم نے اس کا نام "مقصدی طریقہ" رکھا ہے۔

"بنیادی تعلیم" والے بھی اسی طرح کام کرتے ہیں، لیکن انہوں نے شرط یہ رکھی ہے کہ لڑکے مشغلے کے طور پر کسی ایسے حرفے کو پسند کریں، جس میں چیزیں بنا کر بیچنے سے کچھ پیسے بھی مل جایا کریں، کئی سال تک ایک ہی حرفے کا چکر چلتا رہتا ہے، مگر ہے فائدے کی چیز، بشرطیکہ اس کا انتظام ہو جائے کہ لڑکوں کی بنائی ہوئی چیزیں ضرور خرید لی جائیں، اس تجویز کے بنانے والے گاندھی جی، ذاکر صاحب اور دوسرے مشہور

لوگ ہیں، اس پر کئی سال سے عمل ہو رہا ہے، لیکن جامعہ میں "مقصدی طریقہ" سے ایک زمانے سے کام ہو رہا ہے۔

ابھی ہارپر صاحب کا ذکر ہو رہا تھا، ان کی بیوی مسز ہارپر بھی ان کے کام میں مدد دیتی تھیں، جس طرح ایک پڑھی لکھی ماں بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہے، انھیں لکھنا پڑھنا، تمیز، سلیقہ سکھاتی ہے، یہ بھی کرتی تھیں، ایک خاص بات یہ تھی کہ انھیں مذہبی تعلیم کو بچوں کے لیے دل چسپ بنانے کی بڑی فکر تھی، رات دن اسی بات کی کھوج میں رہتی تھیں کہ مذہبی تعلیم کا کون سا طریقہ اختیار کیا جائے، جو بچوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچے میں اکیلا موگا میں ساری باتیں کہاں تک سیکھتا، میرے ساتھی عبدالواحد صاحب نے مسز ہارپر سے یہ کام خاص طور سے سیکھا ہے

اُستادوں کی جماعت کو زیادہ وقت پڑھانے والے ماسٹر بھولو تھے، یہ ہندوستانی عیسائی تھے، اور انھوں نے موگا ہی میں تعلیم پائی تھی، مسٹر کارٹر[۱] کے شاگرد تھے، مسٹر ہارپر ان کے بعد آئے تھے، بھولو صاحب نے ایک دن جماعت والوں سے پوچھا کہ

---

(۱) یہ وہ بزرگ ہیں، جنھوں نے ۱۹۲۰ء میں موگا کا مدرسہ قائم کیا تھا۔ جامعہ بھی ۱۹۲۰ء میں قائم ہوئی تھی، اس طرح ان دونوں اداروں کی عمر ایک ہی ہے۔

آپ لوگ اپنے بچپن کے شغل بتائیے، یعنی آپ کو کن چیزوں سے دل چسپی تھی" میں نے فوراً ہاتھ اٹھایا:

"اچھا آپ ہی بتلائیے۔ لبھومل بولے:

"کھیل تماشے اور سرکس دیکھنے کا شوق بہت تھا" میں نے کہا

"صرف دیکھ لیا کرتے تھے؟"

"جی نہیں! اپنے ساتھیوں سے ان کی نقل بھی کروایا کرتا تھا"

"آپ کے اُستاد اور سرپرست تعریف کرتے تھے یا مذمت؟"

"یہ لوگ اس میں دل چسپی نہیں لیتے تھے۔"

"یہ شوق اب تک باقی ہے؟"

"جی نہ صرف باقی ہے، بلکہ اور بڑھ گیا ہے، جامعہ میں کئی ڈرامے کروائے ہیں، ان میں سے چار ڈرامے خود ہی لکھے ہیں"

لبھومل صاحب سنبھل کر بیٹھ گئے، جماعت کے سارے لڑکے میری طرف دیکھنے لگے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لبھومل صاحب کے ہاتھ کوئی موٹا تازہ شکار لگا ہے، بولے: "آپ میرے پاس آجائیے اور جماعت والوں کو بتائیے کہ یہ کام آپ نے کس طرح آگے بڑھایا ہے، لکھنے کو تو میں سوچ سوچ کر بہت کچھ لکھ لیتا ہوں (جیسے یہ کہانی زیادہ تر یادداشت سے کام لے کر لکھ رہا ہوں) لیکن بولنے میں ربط اور سلسلہ

قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے، پھر بھی اپنے شوق کی چیز تھی، میں بے دھڑک کہتا گیا۔ آخر میں لبھومل صاحب سر ہلاتے ہوئے جماعت والوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے:

"جناب یہی بات تو میں ہر سال کچھ اُستادوں سے کہا کرتا ہوں کہ بچپن میں جو شغل اپنے شاگردوں میں دیکھو، اس کی قدر کرو، اور جیسے جیسے موقع ملے اسے ترقی دو، اب اس پر غور کرو کہ یہ شغل پیدا کیسے ہوتا ہے ؟ کیا یوں ہی بچے کے دماغ میں کوئی بات آجاتی ہے؟ ہرگز نہیں، اپنے اردگرد وہ جو کچھ بھی دیکھے گا اسی طرح اپنے لئے کوئی شغل پیدا کر لے گا، اس لیے یہ بات بھی لازمی ہوئی کہ مدرسہ اور اقامت گاہ میں دستکاری، ڈرائنگ، بنک، دُکان، خونچہ، پنچائت، کھیتی باڑی، بحث مباحثے، جلسے، ڈرامے، کھیل کود، ورزش سب چیزوں کا انتظام ہونا چاہیئے، ورنہ لڑکوں سے شکایت کرنا کہ وہ کچھ کرتے نہیں ہیں بیکار ہے، سچ پوچھو تو لڑکوں کا کبھی قصور نہیں ہوتا۔"

معلوم نہیں آپ لوگوں کو کن کن چیزوں کا شوق ہے؟ دو ایک شغل پیدا کر لیجئے تو آپ کا وقت اچھا گزرے گا، استاد لاکھ کہیں کہ قصور لڑکوں کا نہیں ہے، یہ اُن کی شرافت ہے، آخر آپ کی اپنی بھی تو کچھ ذمہ داری ہے، آپ تو اس بات کو یاد رکھیئے کہ گاڑی،

دونوں پہیوں سے چلتی تھے ، اپنا شوق اور اُستادوں کی مدد ، اِن دو چیزوں کی موجودگی سے کام چلے گا۔

ہماری جماعت میں ایک دن ، ایک اور بحث چھڑ گئی ، ماسٹر صاحب نے پوچھا :

" پہلی جماعت میں داخل ہونے سے پہلے ، بچوں کے شغل کس قسم کے ہوتے ہیں ۔"

جماعت والوں نے کہا :

" اِدھر اُدھر کی چیزیں جمع کرنا ، کچھ بنانا ، کچھ بگاڑنا ، چیزوں کے ساتھ کھیلنا ، قصے ، کہانیاں سننا وغیرہ "

" عام طور پر پہلی جماعت میں کام کس طرح شروع کیا جاتا ہے "، بھولو صاحب نے پھر پوچھا :

" یہی کوئی ایک قاعدہ خرید واکر الف ، بے ، پے ، تے پڑھانا شروع کر دیتے ہیں " یہ ہمارا جواب تھا ۔

" اگر ابتدا ہی سے کوئی شخص کہانی پڑھانے لگے تو لڑکے اس میں دل چسپی زیادہ لیں گے یا الف بے ، پے پڑھنے میں " ہم نے تعجب سے کہا

" کہانی پڑھنے میں دل چسپی تو ضرور لیں گے ، مگر الف ، بے پے

یاد کیے بغیر بھلا کوئی کہانی بھی پڑھ سکتا ہے۔

کہنے لگے: "بے شک پڑھ سکتا ہے، اور بڑے شوق سے پڑھ سکتا ہے، اُستاذ کا کام شناخت کرانا ہے، چاہے پورے جملے کی ہو یا الف بے پے کی۔ ان میں جو چیز دل چسپ ہوگی اور کھیل کی صورت اختیار کرے گی، لڑکے اسی کے پیچھے پڑ جائیں گے، آپ لوگ تجربہ کرکے دیکھیے، ایک چھوٹی سی کہانی سُنا کر اس کے چند جملے دفتیوں پر علیحدہ علیحدہ لکھ لیجیے مثلاً:

ایک ننھا کوّا

ایک ننھا طوطا

ایک ننھی چڑیا

چڑیا بولی وغیرہ

بچّوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ بڑوں کی نقل کرنا پسند کرتے ہیں، ان سے کہیے کہ وہ اس کہانی کو پڑھیں، آپ جیسا پڑھیں گے وہ بھی ویسا ہی پڑھنے لگیں گے، ان جملوں کو شناخت کرانے کے لیے طرح طرح کے کھیل کھلائیے، مثلاً ایک ننھا کوّا کی طرف اشارہ کرکے ان سے کہیے کہ تمہارے سامنے جو دو جملے پڑے ہیں، ان میں سے ایسا ہی ایک ڈھونڈ کر نکالو، آپ دیکھیں گے کہ لڑکے پہلے تو تختۂ سیاہ پر

نگاہ جمائیں گے، پھر سامنے والے ڈھیر کو اُلٹ پلٹ کریں گے، کچھ لڑکے چپ چاپ دیکھ رہے ہوں گے کہ یہ کیا ہو رہا ہے، بس ایسا معلوم ہوگا کہ اُستاد اور لڑکے مل کر کسی اہم بات کی کھوج میں ہیں، پھر اسی ایک کھیل پر کیا موقوف ہے، اسی طرح کے بیسیوں کھیل ہو سکتے ہیں، مجال ہے جو جماعت میں لڑکوں کا جی گھبرائے، ہر لڑکا یہی چاہے گا کہ جماعت میں رہے، اگر ہم ان سے پہلے ہی کہیں کہ یاد کرو الف بے، پے، تو سوال یہ ہے کہ وہ کیوں یاد کریں؟ انھیں کیا معلوم کہ یہ چیز آگے چل کر پڑھنے لکھنے میں کام آئے گی، یہ الف بے پے نہ تو کوئی کہانی ہے، نہ پرندوں اور جانوروں کے نام ہیں، نہ کھیلنے کی چیزیں ہیں، پھر وہ انھیں کیوں یاد کریں؟ ہاں دوسروں کو پڑھتے لکھتے ہوئے دیکھیں گے اور اس کی نقل مشق کے طور پر کروائیے گا تو شوق سے کریں گے۔

معاملہ ہماری سمجھ میں اب تک نہیں آیا تھا، ہم نے کہا "اچھا صاحب آگے چلئے"۔

"جب ایک چھوٹی سی کہانی کے جملے شناخت کرلیں۔ تو ان کے لفظ بھی شناخت کروائیے"۔

"پھر ہم نے کہا":

جب یہ کام ہو جائے تب ان لفظوں کی آوازیں الگ الگ کرکے بتائیے۔

مثلاً سب میں = س۔ب

رب میں = ر۔ب

اب میں = ا۔ب

اب ہماری سمجھ میں کچھ آنے لگا تھا۔

"جب یہ آوازیں وہ جان جائیں، تب انھیں آوازوں سے نئے نئے لفظ بنوائیے۔ مثلاً

س۔ر = سر

ر۔س = رس

حرفوں کے نام لے کر ہجے کرنے سے بات سمجھ میں نہیں آتی ہے مثلاً س بے زبر "سب" کیسے ہوگا، یا سین رے زبر سر اور دال موقوف "سرد" کیسے ہوگیا!

آپ کہیں گے کہ ماسٹر صاحب! ہماری سمجھ میں تو بات آجاتی ہے مگر سوال آپ کا نہیں ہے، بلکہ بالکل چھوٹے بچوں کا ہے، اپنے بچپن کو یاد کیجیے چھ سال کی عمر میں چند حرف یاد کرنے کے لیے کس قدر ٹھکائی ہوتی تھی!

"اب اس کے آگے جو کچھ بتایا وہ سمجھ میں آنے والی بات تھی" میں نے کہا

"تو بات یوں ہوئی کہ محض چڑیا پھانسنے کے لیے دانے ڈالے جاتے ہیں"!

"اور کیا! —— لیکن اس چڑیا کو آزاد رکھ کر پالتے ہیں"

"آزاد رکھ کر پالنے پر بھی ایک لمبی چوڑی بحث ہوئی، مگر اب ساری باتیں کہاں تک لکھوں —— ہاں یہ بتادوں کہ اُردو پڑھانے کے جس طریقے کا میں نے ذکر کیا ہے اسے "کہانی کا طریقہ Story Methed" کہتے ہیں۔[1]

---

(۱) جامعہ میں واپس آنے کے بعد جب میں نے اس پر عمل کیا تو اس میں مجھے بعض نقائص نظر آئے، مثلاً اس طریقے سے پڑھانے میں جو ترتیب رکھی گئی ہے وہ انگریزی زبان (غیر صوتی زبان) کو مدنظر سامنے رکھ کر دی گئی ہے، یہ ڈھانچہ (میری مراد ترتیب ہے) صوتی زبانوں جیسے اُردو، ہندی کو سامنے رکھ کر بنایا جاتا تو یہ ہمارے لیے مفید ہوتا، مثلاً اُردو یا ہندی کے چند حرف سکھاتے ہی، ان سے با معنی لفظ بن سکتے ہیں، اس لیے اپنے تجربے کی بنا پر میں نے اس قسم کے طریقوں کو سامنے رکھ کر ملے جلے طریقے کی بنا پر ایک طریقہ مرتب کیا ہے، جس کا نام "جامعہ کا طریقہ" رکھا ہے، کام کی ابتداء گیت سے کی گئی ہے، لیکن گیت کے مصرعے اور لفظوں کو شناخت کرانے کی بجائے اس گیت کے لفظوں کی مدد سے حرف اخذ کرا کے صوتی طریقے سے رفتہ رفتہ لفظ اور جملے بنوائے گئے ہیں، اس طرح اُردو ہندی کو کہانی کے طریقے سے سکھانے میں جو غیر ضروری طوالت سے کام لیا گیا تھا اس سے بچا لیا گیا ہے۔ "جامعہ کا طریقہ" نامی کتاب شائع کر دی گئی ہے، جس میں اس ملے جلے طریقے کو تفصیل سے سمجھایا گیا ہے

لکھنے پڑھنے کا کام صرف کتابوں تک ہی محدود نہیں ہے، لبھول صاحب کچھ اور بھی بتایا کرتے تھے —— باوجود امریکن عیسائیوں کے ماتحت کام کرنے کے وہ کھلم کھلا اپنی جماعت والوں سے کہا کرتے تھے "تم لوگوں کو ولایت کے عیسائیوں کا محتاج نہ رہنا چاہیئے، آج مسٹر ہارپر اور ان کے ساتھی مدرسہ چھوڑ کر امریکہ چلے جائیں یا اس مدرسے کو بند کرنا چاہیں تو تم میں ایسی صلاحیتیں ہونی چاہیں کہ اس مدرسہ کو چلا سکو، بس سارا گُر یہ ہے کہ کسی کام میں عیب نہ سمجھو، دوسروں کی نکتہ چینی سے فائدہ اُٹھاؤ، باتیں کم کرو اور کام زیادہ، کام کا مقصد صرف پیٹ پالنا نہ سمجھو، پیٹ تو جانوروں کے بھی پل جاتے ہیں، اپنے پیٹ کی فکر میں غلط راہ پر چل کر برباد نہ ہو صرف یہ دیکھو کہ تم نے اپنے ذمے جو کام لیا ہے آیا وہ ٹھیک سے ہو رہا ہے یا نہیں! —— یہ سوال تم خود ہی اپنے آپ سے کرو"

موگا کا ہر اُستاد پڑھنے پڑھانے کے علاوہ کوئی نہ کوئی ہاتھ کا کام کرتا تھا، تاکہ لڑکوں میں بھی یہ شوق پیدا ہو جائے، لبھول صاحب سب اُستادوں کی حجامت بنایا کرتے تھے اس سے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی، یہ بات مذاق میں نہیں لکھی ہے، موگا سے واقفیت رکھنے والے لوگ اس کی تصدیق کریں گے۔

ماسٹر سموئیل کھیتی باڑی کا کام سکھاتے تھے لڑکے ان کی مدد کرتے

تھے، یہ سب کی شکایات سُنتے بھی غور سے تھے اور جو کچھ سُنتے تھے اس کی اصلاح کی بھی کوشش کرتے تھے، مگر ایک کی بات دوسرے سے نہیں کہتے، تب ہی تو لڑکے اپنے دل کی بات ان سے کہہ دیتے تھے

جماعتوں میں مقصدی طریقے سے پڑھنے لکھنے کا کام ہوتا تھا لیکن ہر ایک لڑکے کے لیے محنت مشقت کا کام کرنا بھی ضروری قرار دیا گیا تھا، مدرسہ اور اقامت گاہ میں ایک بھی ملازم نہیں تھا، سارا کام لڑکے ہی باری باری سے کرتے تھے (صرف میلا اُٹھانے کے لیے چند بھنگی رکھ لئے گئے تھے) کھیتی باڑی کا کام بڑے پیمانے پر ہوتا تھا تاکہ چھوٹے سے بڑے تک سب کو اس میں حصّہ لینے کا موقع مل سکے۔ پہلی دوسری، اور تیسری جماعتوں کے لڑکوں کے لیے تو عملی کام کی پابندی نہیں تھی۔، باقی جماعتوں کے لیے لازمی تھی

(۱) چوتھی سے آٹھویں تک پانچ اور اُستادوں کی جماعت کو ملا کر چھ جماعتیں ہوئیں، اتوار کا دن نکال کر ہفتہ کے چھ دن رہ جاتے ہیں، ہر ایک جماعت باری باری سے ہفتہ میں ایک روز سارے دن عملی کام کرتی تھی، لڑکوں کی ٹولیاں بنا دی جاتی تھیں، کھیتوں کی نرائی، رہٹ چلانا، کیاریوں میں پانی دینا، سبزیوں کا کام، بیلوں کے احاطے کی صفائی خاص میدانوں کی صفائی، نالیاں بنانا، سڑکوں کی مرمت، بڑھئی کا کام

رسّی بٹنا، بید کا کام غرض کہ تعداد کے لحاظ سے جماعتوں میں کام تقسیم ہو جاتے تھے ان لڑکوں کا یہ عملی دن (Practical Day) کہلاتا تھا، سارے دن کے کام کی اُجرت چھوٹوں کو چھ آنے اور بڑوں کو دس آنے ملتی تھی

(۲) روزانہ سہ پہر کے وقت مذکورہ بالا چھ جماعتوں کے ہر ایک لڑکے کے لیے ان میں سے کوئی ایک کام ایک گھنٹہ کرنا ضروری تھا اس کی اُجرت بھی چھوٹوں کو ایک آنہ اور بڑوں کو ڈیڑھ آنہ ملتی تھی (۱)۔

(۳) ہر ایک جماعت کے دو لڑکے یعنی بارہ لڑکے روزانہ کھانا پکانے ڈاک لانے لے جانے، کا غذات تقسیم کرنے اور گھنٹہ بجانے کا کام کرتے تھے۔ (کسی دن کام زیادہ ہو تو "عملی دن" والے بھی اس فریق میں شریک کر دیئے جاتے تھے) اگر کسی جماعت میں تیس لڑکے ہوں تو اس طرح ہر ایک کی باری مہینے میں دو دفعہ آتی ہے

اس مدرسہ میں تمام ترغریبوں کے لڑکے تعلیم پاتے تھے اس لیے جو دام انھیں ملتے تھے، ان سے یہ کتابیں خریدتے تھے اور کھانے کی فیس ادا کرتے تھے جو لڑکے دوسری ضروریات کے لیے کچھ اور کمانا

---

(۱) اُجرت کی یہ شرح اُس زمانے میں تھی، جب میں وہاں پڑھتا تھا۔ (سنہ ۱۹۳۰ء)۔

چاہئے تو وہ فرصت کے وقت یا چھٹیوں میں زائد کام کر سکتے تھے، اس طرح موگا کے ہر ایک طالب علم کو یہ شرف حاصل تھا کہ وہ اپنا پیٹ آپ پالتا ہے، اب رہ گئی اُستادوں کی تنخواہیں اور عمارتوں کا خرچ، کچھ تو گورنمنٹ دیتی تھی اور کچھ ولایت کے عیسائی۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ موگا میں پڑھائی کم ہوتی ہے اور لڑکوں کو محنت و مشقت کا کام زیادہ کرنا پڑتا ہے مگر موگا والے یہ جواب دیتے ہیں کہ آپ کسی ایسے سرکاری مدرسے کو لے لیجئے، جس میں سارے دن مدرسہ کی چار دیواری میں رہ کر کام کرنا پڑتا ہو، اور اس کی اور موگا کی پڑھائی کا مقابلہ کر لیجیے، موگا کی پڑھائی کہیں زیادہ نکلے گی، آپ ذرا موگا کے مدرسے کے نظام اوقات پر غور کیجیے، ہفتے میں پانچ دن دل چسپ طریقے سے پڑھنا پڑھانا، ایک کی بجائے دو چھٹیاں منانا، ان میں سے ایک چھٹی میں آرام اور دوسری میں کھلے میدانوں میں نکل کر ہاتھ پاؤں کے جوہر دکھانا اور کھیتی باڑی کا کام کرنا، پھر مہینے میں دو دن باورچی، بیرے، چپراسی، ڈاکیے، بہشتی کی نقل کا دل چسپ مشغلہ (۱)، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ بعض لوگ ناک بھوں

---

(۱) جامعہ کے مدرسہ ابتدائی و ثانوی میں سال میں ایک دفعہ " ایک دن کا مدرسہ " ہوتا ہے، جسے چلانے کے ذمہ دار لڑکے ہوتے ہیں، مذکورہ کاموں کے علاوہ عملۂ مدرسہ، اُستاد، منشی سب کے سب اسی مدرسے کے طالب علم ہوتے ہیں۔
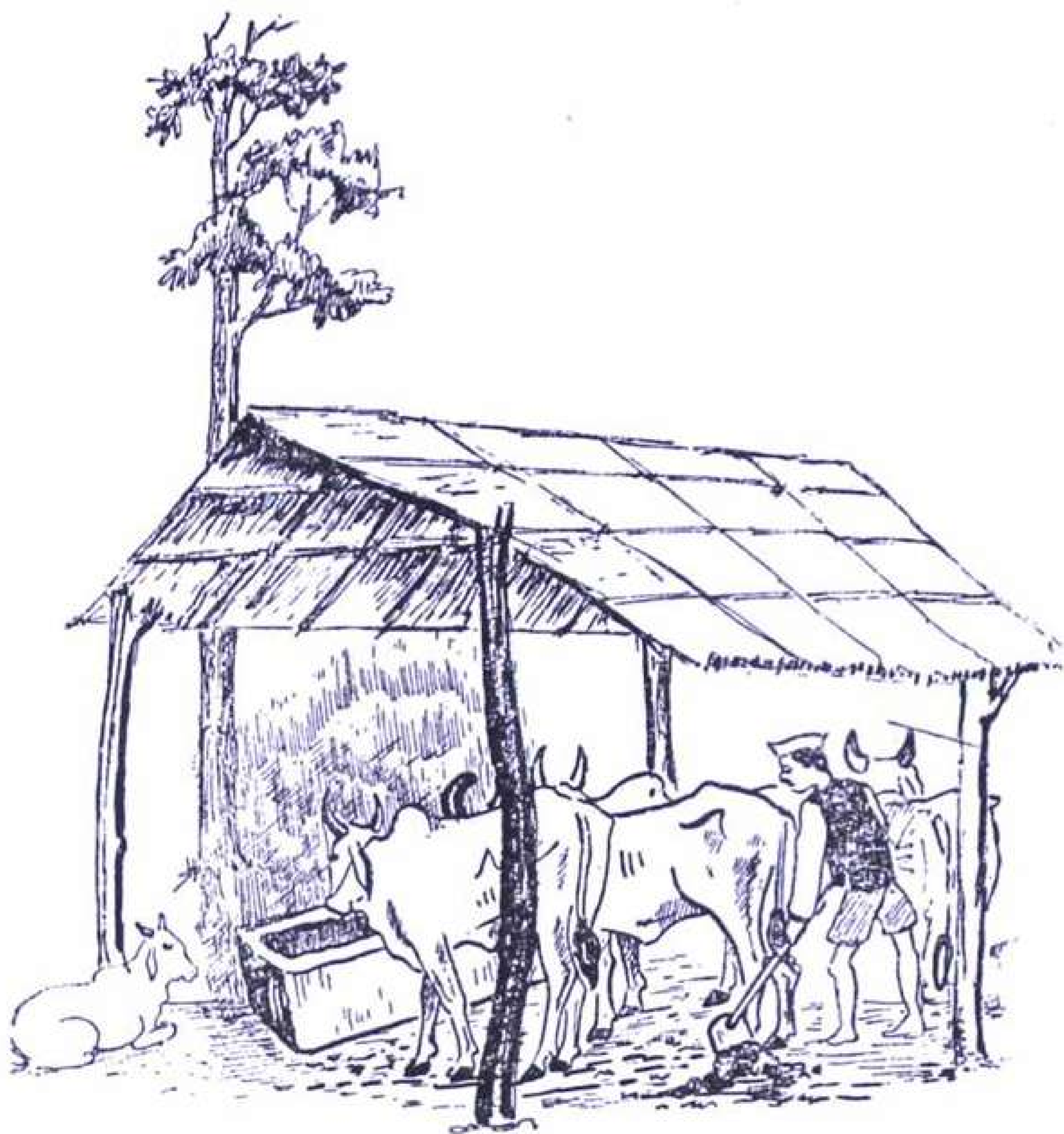
کیوں پڑھاتے ہیں، لڑکیں سستی کی وجہ سے لکھنے پڑھنے سے جی چرائیں
یا بیکار مارے مارے پھریں، عادتیں خراب ہوں، بیمار رہیں، جماعتوں سے
بھاگیں، حاضری کم ہو، ان چیزوں کو کوئی نہیں دیکھتا، لیکن جب کام ہو رہا
ہو تو ضرور اعتراض ہوگا: "پڑھائی کا حرج ہوتا ہے، جانے یہ خالی خولی
پڑھائی کیا کام آئے گی"!

میں نے بھی اپنے ذمے بیل گھر کے احاطے کی صفائی کا کام لے رکھا
تھا، جس دن ہمارا عملی کام ہوتا، صبح صبح بیل خانے میں پہونچ کر تمام
گوبر پھاوڑے سے ریڑھی (دو پہیوں کی گاڑی) میں بھر کر گھور (کھتہ)
میں ڈال آتا، پھر کٹی (باریک چری) بھوسہ چنے کا موٹا آٹا ملا کر جانوروں
کے سامنے رکھ دیتا (اسے سانی کہتے ہیں) اور اس کے ساتھ لاہوری
نمک کی بڑی بڑی ڈلیاں بھی (جسے جانور چاٹتے ہیں) رکھ دیتا
کنویں پر جانوروں کو لے جا کر پانی پلاتا، موگا والے پوچھتے آپ کو
کوئی تکلیف تو نہیں ہے، میرا یہی جواب ہوتا کہ تکلیف کیسی،
ہفتہ میں ایک دن کے بجائے دو دن کی چھٹی مل جاتی ہے --- ہاں
یہ بات ضرور ہے کہ، مئی اور جون میں گرمی بہت ستاتی تھی، لیکن ہم بیشتر
وقت درختوں کے سائے میں گا بجا کر گزار دیتے تھے، یہ بات پرانی
ہے، سنا ہے کہ اب بہت سی تبدیلیاں ہوگئی ہیں، ممکن ہے گرمی کی

شدت سے بچنے کا بھی کچھ انتظام ہو گیا ہو، عملی کام کے سلسلے میں ایک دلچسپ بات یاد آئی، ہم لوگ کھیتوں میں پانی دینے کے لیے چھوٹی نہر بنا رہے تھے کئی ہفتوں کی محنت کے بعد جب یہ مکمل ہو گئی تو بڑی نہر سے پانی چھوڑا گیا، ایک جگہ بند ٹوٹ گیا، پانی زور سے بہا جا رہا تھا، لڑکے سٹ پٹا گئے ہاریر صاحب وہاں موجود تھے (کام کے لباس میں) فوراً پانی روکنے کے لیے لیٹ گئے اور چلائے کہ جلدی سے مٹی لگاؤ، لڑکوں نے یہ دیکھا تو نہایت مستعدی کے ساتھ آس پاس سے مٹی کھود کر جلدی جلدی بند باندھ دیا، پانی اور کیچڑ سے سب لت پت ہو گئے، بعض لوگوں نے تو قصداً لوٹ لگائی، جی چاہتا تھا کہ ایک جگہ سے اور بند ٹوٹے تو مزہ آ جائے، لیکن ہاریر صاحب نے کہہ دیا تھا کہ ایسی شرارت نہ کرنا

یہاں بھی سال میں دو ڈرامے کھیلے جاتے تھے، ایک بڑے دن پر مدرسے کے لوگوں کے لیے، دوسرا دیہات والوں کے لیے، جامعہ میں کھیلے ہوئے ایک ڈرامے کو مقامی رنگ دے کر میں نے یہاں کے لڑکوں سے اسٹیج کروایا تھا، دیہات والوں کا ڈراما بھی میرے سپرد ہوا، ملیریا سے متعلق تھا، اور اسے ہماری جماعت والوں نے کھیلا تھا

مدرسہ کی ایک پنچائت تھی، جس میں لڑکوں کے اہم معاملات جن کا تعلق سزا سے ہوتا تھا طے ہوتے تھے، صدارت کے لیے دو امیدوار

تھے، جن میں سے ایک میرا نام تھا، کثرت رائے سے میں چن لیا گیا، پنچانوے فی صدی لڑکے عیسائی تھے، لیکن ان میں بڑی تعداد نے عیسائی لڑکے کے مقابلہ میں مجھے رائے دی - اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ لڑکے تنگ نظر نہیں ہوتے ہیں وہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ کون شخص کس کام کا ہے، ہارپر صاحب نے فرمایا کہ موگا کی تاریخ میں یہ پہلی مثال ہے کہ ایک غیر عیسائی یہاں کی پنچائت کا صدر ہوا ہے - انہوں نے امید ظاہر کی کہ اس انتخاب کی وجہ سے مجھے پہلے سے زیادہ لڑکوں کا اعتماد حاصل کرنے کا جو موقع ملا ہے، اس سے فائدہ اُٹھاؤں گا، جب میں مدرسے سے رخصت ہوا تو انہوں نے مجھے بہت اچھا سرٹیفکٹ دیا

اُستادوں کی جماعت باہر کا تجربہ حاصل کرنے اور مشقی سبق کے لیے موگا سے کافی دُور کسی اور علاقے میں بھی چلی جاتی تھی - یہ سفر پندرہ پندرہ دن کا ہوتا تھا، کسی مقام کو مرکز قرار دے کر وہاں پڑاؤ ڈال دیتے تھے، پھر پروگرام کے مطابق اس کے پاس گاؤں میں سبق دینے کے لئے چلے جاتے تھے مسلسل ایک ہفتہ تک سبق دیتے ، باری باری سے ایک ٹولی کھانا پکاتی ، اور مرکز کی نگرانی کرتی ، باقی لڑکے صبح کھانا کھا کر ۔ے جاتے ، اور چار بجے لوٹتے ، دوسرے ہفتے میں کسی دیہات میں ڈیرا کرتے تھے، وہاں کے لوگوں کے کاموں کے سمجھنے کے بعد انھیں

مشورہ دیتے بعض کام مثلاً صفائی وغیرہ کا طریقہ خود کر کے بتلاتے
رات کو گانے بجانے کا شغل رہتا ۔ اس کے بعد موگا گے ایک مقامی
میلے میں حصہ لیتے تھے، مگر افسوس کہ ان دلچسپیوں کے بعد مارچ میں امتحانات
شروع ہو جاتے تھے، دو تین دن کی الوداعی تقریبوں کے بعد جس میں لڑکوں
اور اُستادوں کے میچ اور طرح طرح کے کھیل بھی شامل تھے، مارپر صاحب
ان "کچے استادوں" کو جو اب "پکے ہو چکے ہوتے" بڑی محبت کے بعد رخصت
کرتے ۔ پہلے استادوں کی جماعت کی ٹریننگ کی مدت ایک سال کی
ہوتی تھی مگر بعد کو دو سال کر دیئے گئے تاکہ سارے کام بھاگ دوڑ میں نہیں
بلکہ اطمینان سے ہوں

مجھے جامعہ کی آزاد فضا میں جی لگا کر کام کرنے کی عادت تو ہو گئی
تھی اور کام کے بارے میں میرا جو رویہ تھا اس پر پختگی کے ساتھ قائم
بھی تھا، موگا والوں کی تعلیم اور یہاں کی طرز زندگی نے مجھے اپنے خیالات
کو عمل میں لانے کی ایک نئی راہ دکھائی اور میں خوش خوش یہاں سے لوٹا۔

سات سال کے بعد گھر کا سفر

موگا سے میری واپسی وسط اپریل میں ہوئی تھی، ڈیڑھ مہینے کے بعد جامعہ کا مدرسہ بڑی چھٹیوں کے لیے بند ہونے والا تھا، امتحانات کی تیاریاں ہو رہی تھیں، بہتر یہی معلوم ہوا کہ میں تعلیمی سال کے آغاز سے اپنا کام شروع کروں، اس طرح ساڑھے تین مہینے کی چھٹی مل گئی، مجھے گھر سے آئے ہوئے پورے سات برس ہو گئے تھے، خط و کتابت جاری تھی اور ہر خط میں والدہ صاحبہ یہی پوچھتی تھیں کہ تم کب آؤ گے؟ اس کتاب کو پڑھنے والے کہیں گے، کیسا بے مروّت ہے، سات سال ہو گئے اب تک والدہ کو صورت نہ دکھائی، ہاں بھائی جو چاہے کہئے مگر میری مجبوریوں کو بھی تو دیکھئے پھر ایک بات یہ بھی تھی کہ میں کچھ حاصل کرنے کے بعد گھر جانا چاہتا تھا، تاکہ بستی والوں کے سامنے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے، اب مجھے جامعہ جیسی مشہور درس گاہ میں کام کرنے کا موقع مل گیا تھا، پھر موگا کے امتحان میں درجہ اوّل بلکہ سارے مدرسے میں اوّل آنے کی اُمید تھی اور ساڑھے تین مہینے کی چھٹی بھی مل گئی تھی — ، والدہ سے ملنے کی آرزو نے پہلے ہی سے بے چین کر رکھا تھا، چنانچہ میں نے گھر جانے کا فیصلہ

پہلے سے سوچی ہوئی بات ہوتی تو گھر خط لکھتا، اب تو یہی خیال تھا کہ خود ہی پہونچ جاؤں گا، پھر وہی لمبا سفر، ریل زناٹے سے چلی جارہی تھی اور میرے دل میں خیالات کا ہجوم تھا ——— لیکن اس دفعہ یہ خیالات خوشگوار تھے، پچھلی مصیبتوں کی یاد سے تکلیف محسوس بھی ہوتی تو آنے والی خوشی کا خیال اِسے دُور کر دیتا۔ روپے تو اب بھی میرے پاس تھوڑے ہی تھے، پچیس روپے ماہوار میں کیا بچاتا، مہینے کے مہینے پانچ روپے تو والدہ کے لیے بھیج دیتا تھا، ہاں اتنی بات ضرور تھی جستی حلوہ، دلّی کے چند جوڑی جوتے، دو ایک کام دار ٹوپیاں، والدہ کے لیے پان کا مصالحہ تحفے کے طور پر لے کر چلا تھا اور بڑی بات یہ ہے کہ گھر تک کا ریل کا ٹکٹ جیب میں تھا، سوچتا تھا کہ جب ماں کو معلوم ہوگا، بیٹا آیا ہے تو خوشی سے ان کا کیا حال ہوگا، بس یہی جی چاہتا تھا کہ گاڑی کی رفتار دُگنی ہو جائے ——— آگرہ آیا، میں جھٹ سے اُتر پڑا اور اس پولیس والے کو ڈھونڈھنے لگا، جس نے میری باتیں ہمدردی سے سُنیں اور روٹی کھلائی تھی، بہت تلاش کیا، مگر نہ ملا، معلوم ہوتا تھا بدلی ہو گئی ہے، گاڑی نے سیٹی دی، میں لپک کر چڑھ گیا، جانے کتنے ہی ٹکٹ چیکر آئے، اور چلے گئے، میں سب کی طرف لاپروائی سے دیکھتا رہا۔

"ٹکٹ" ایک نے کہا۔

"ٹکٹ موجود ہے، ذرا اس صراحی کے دام دے لوں" پھر ٹکٹ جانچنے والے نے بھی پروا نہ کی، آگے بڑھ گیا

منماڑ کا اسٹیشن آیا، یہاں گاڑی بدلنی تھی، جی چاہتا تھا، پھر کسی بھٹیارن کی دکان مل جائے تو کھاتے ہوئے کچھ باتیں کروں، علی گڑھ کی بھٹیارن کا اور اپنا قصہ سناؤں، مگر ایک ہوٹل میں جانا پڑا، کھلانے والے نے پوچھا: "کیا کھائیے گا صاحب؟

"کیا کیا تیار ہے؟" میں نے بھی سوال کیا۔

"آلو گوشت، مٹر گوشت، آلو پالک، میتھی پالک، پلاؤ، چپاتی میٹھی چیزوں کے نہ جانے کیا کیا نام لے ڈالے

"خشکا بھی ہے؟" میں نے پھر پوچھا۔

"نہیں ہے صاحب" بیرر نے جواب دیا

"آخر یہ کیوں نہیں تیار رہتا" میں نے کہا

"یہ مرہٹواڑی ہے صاحب، تلنگانہ نہیں ہے، آرڈر دینے سے آدھ گھنٹے میں تیار ہو جائے گا۔"

آلو گوشت اور چپاتی پیٹ بھر کر کھالی، اب ریاست کی گاڑی چھک چھک کرتی چلی جارہی تھی ——— دولت آباد کا قلعہ ———

اورنگ آباد کا اسٹیشن، جہاں مڈل کا امتحان دینے آیا تھا، اس سے اگلا اسٹیشن گیورائی، جس نے بچپن میں ریل کا سفر ختم ہونے کی منحوس خبر سُنائی تھی، جالنہ کا اسٹیشن جہاں کے پراٹھے پشاوری پراٹھوں سے مختلف ہوتے ہیں، ایک ایک کر کے گذر رہے تھے، ایک اسٹیشن پر کسی نے آواز دی، غفّار صاحب، غفّار صاحب، مگر گاڑی چل دی، پربھنی اور ناندیڑ کے اسٹیشن گذرے، پربھنی پر محمد حسین صاحب اور ناندیڑ کے اسٹیشن پر الف الدین صاحب کا خیال آیا، مگر میں کسی کو اطلاع نہ دے سکا تھا۔ ورنہ یہ دونوں یہاں ضرور ملتے۔ محمد حسین صاحب جامعہ کے بی۔ اے ہیں اب مدرسہ ثانوی کے اُستاد ہیں، الف الدین صاحب بھی پُرانے دوستوں میں سے ہیں اور ناندیڑ میں مدرس ہیں، باسر کا اسٹیشن قریب آ رہا تھا، اب چھُپنے کا سوال نہ تھا، کھڑکی کے قریب بیٹھا تھا، جھانک جھانک کر دیکھنے سے کپڑے میلے ہو گئے تھے، آس پاس کے گاؤں دکھائی دے رہے تھے دھرم آباد، بالاپور، ہاں یہ وہی مقامات ہیں، جہاں ہم میچ کھیلنے آیا کرتے تھے، دُور سے گوداوری کا پُل دکھائی دیا ــــــــــ اسی جگہ باسر اسٹیشن ہے، مُنہ پر ہاتھ پھیرا گر دن صاف کی ــــــــــ گاڑی کانپتی ہوئی ٹھہر گئی۔

اب قلی بھی نظر آ رہے تھے، اتارنا صندوق کو! کیوں بھائی

بیل گاڑی تیار مل جائے گی؟"

"بیل گاڑی ——— ! بھائی صاحب ! ابھی موٹر بس تیار کھڑی ہے"
قلی نے تعجب سے کہا۔

قلی کو کیا معلوم تھا کہ میں سات برس کے بعد لوٹا ہوں، یہیں کا رہنے والا ہوں، کوئی آدھ گھنٹے میں "بس" نے مدہول کے ڈاک خانہ پر پہونچا دیا

"غفار صاحب، غفار صاحب" کی آوازیں ہر طرف سے آنے لگیں، کچھ لڑکے دوڑتے ہوئے نہ جانے کدھر چلے گئے اور اپنے ساتھ کچھ اور لڑکوں کو لے آئے، ایک لڑکے نے ایک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: " یہ آپ کے بھتیجے ہیں" اس بچے کو (عبدالبصیر) دودھ پیتا، چھوڑ گیا تھا، میرا سامان گھر پہونچ گیا، لڑکوں کو نہ جانے کیا لطف آرہا تھا، وہ میرے ساتھ ہو لئے، ان میں سے بہت سوں کو نہیں پہچانتا تھا. مگر وہ مجھے اس طرح دیکھتے تھے جیسے کہ میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں، میں اپنے گھر کی طرف جانے لگا، ایک لڑکے نے کہا:

" وہ گھر تو بنئے کے پاس رہن ہے، ماموں کے پاس چلئے"

میں کچھ سست پڑ گیا، اور لڑکوں کی طرف دیکھنے لگا، دوسرے نے پہلے کی طرف دیکھ کر کہا:

" پگلے بھلا ایسی بات یہاں کہنے کی ہے" پھر میری طرف دیکھ کر

بولا :

" آپ ماموں کے گھر چلیئے، آپ کی ماں اور بھائی وہیں رہتے ہیں — "

مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے پیر بھاری ہو گئے ہیں، میں خالی ہاتھ ہوں، مکان رہن ہے اور ماں مصیبت میں! لڑکے جس طرف لئے جا رہے تھے، میں چلا جا رہا تھا، سامنے نظر جو پڑی تو دیکھا، ماں دروازے کے قریب ساری کا آنچل سر پر رکھے کھڑی ہیں (خدا کا شکر ادا کرتے وقت عورتیں خاص طور پر سر کو ڈھک لیتی ہیں۔) ماں نے گلے لگا لیا اور زار زار رونے لگیں۔ بڑے بھائی قریب آ گئے، تھوڑی دیر بعد بولے۔ :

" ماں اب تو خوش ہونے کی بات ہے، اب کیوں روتی ہو "۔

ماں نے میرے آنسو پونچھے۔

ایک لڑکے نے اپنی کارگذاری سناتے ہوئے کہا :

" یہ پُرانے مکان کی طرف جا رہے تھے، ادھر لے آیا "۔

" ہاں بیٹا وہ مکان بھی چھوٹ جائے گا "۔ ماں نے کہا۔

لڑکے نے اس قصّہ کو پھر چھیڑ دیا تھا، تھوڑی دیر کے بعد میں نے کہا۔ :

"ماں مکان رہن ہو گیا ہے مجھے خبر بھی نہ کی"

"بیٹا تمہارے بھائی لکھ رہے تھے، میں نے کہا، نہ جانے وہ کس حالت میں ہے، اگر تکلیف میں ہوا تو اس خبر کو سن کر اور پریشان ہوگا اس لیے میں نے اطلاع نہ کروائی" ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں، لڑکے ایک ایک کر کے چل دیئے، ماں پوتی کو لے کر ناشتہ کی تیاری میں لگ گئیں

اب پُرانے ساتھی ایک ایک کر کے آنے لگے، ان میں سے باپ کو یقین نہیں آتا تھا کہ میں اپنے ساتھ کچھ دولت نہیں لایا، طرح طرح کے سوال کرنے لگا

" امتحان کے نتیجے کی نوبت بعد میں دیکھی جائے گی، پہلے یہ بتائیے کہ ماہوار کماتے کیا ہیں اور ساتھ کیا لائے ہیں، اس موقع پر ماں بھی قریب بیٹھ گئیں کہ شاید کوئی خوش خبری سناؤں، میں نے آبدیدہ ہو کر کہا:

" ابھی تو تنخواہ ہی کم ہے، بچانے کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔"

" لوگ کہتے تھے کہ لوٹے گا تو دولت ساتھ لائے گا" سُن لیا بیجی ـــــ آپ کے غفار نے کیا جواب دیا ہے، ساتھی نے محبت آمیز نفرت سے کہا

" ہاں دولت ہی لایا ہے، بیٹا سات برس کے بعد ماں سے

ملا ہے، یہی بڑی دولت ہے" ماں نے تیزی کے ساتھ اٹھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں، آپ تو ان کے پیٹھ پیچھے حمایت کرتی تھیں، اب کیوں نہ کریں گی" ساتھی نے کہا

"خیر ایک زور دار ڈراما کروا دیں ——— ہم سمجھیں گے کہ بڑے لائق ہو گئے ہیں"، دوسرا دوست بولا۔

گفتگو کا رخ بدلا، فضا بدلی ——— کچھ مذاق ہونے لگا۔ میں ان چیزوں میں حصہ تو لے رہا تھا، مگر اس مصیبت کو کیسے بھلا سکتا تھا ——— بہن اور پھوپھی یاد کرکے مر گئی تھیں، ہاں محلے کی ایک بہن (محی الدین بی) زندہ تھی جو میری محنت کی قدر کرتی تھی، اور مصیبت میں کام آتی تھی ——— کچھ ٹہلنا چاہتا تھا، وہیں پہونچا کچھ اور حالات معلوم ہوئے، وہ یہ بھی کہتی تھیں " بوڑھی ماں نے رو رو کر سات برس گزار دیئے ہیں، سب لوگ یہی کہتے تھے کہ تم نے دوسری جگہہ شادی کرلی ہے لیکن ماں کی آس قائم تھی، وہ ہمیشہ یہی کہتیں: "جب تک میں زندہ ہوں، مجھے امید ہے کہ میرا بیٹا ایک نہ ایک دن ضرور آئے گا" ——— جب کبھی تمہارا خط آتا سر پہ آنچل رکھ کر پہلے بھائی سے سنتیں، پھر اس خط کو محلّے کے بچّوں سے پڑھواتیں ——— میرے پاس خوش خوش چلی آتیں اور کہتیں غفّار کا خط آیا ہے، اچھا ہوا تم آئے ماں کی

بات پوری ہوئی، بہن نے ناشتہ کے لیے کہا، لیکن میں یہ کہہ کر چل دیا کہ ماں انتظار کرتی ہوں گی، گھر پہونچا، کیا دیکھتا ہوں کہ پراٹھے، انڈے اور چائے سب کچھ تیار رکھے ہیں، ناشتہ کیا، دو راتوں کا جاگا ہوا تھا سو گیا

دوسرے دن شام کے وقت گجری (شام کا بازار) دیکھنے نکلا وہی مستان تنبولی (کھلے پان بیچنے والا) بیٹھا ہے، جسے بچپن سے دیکھتا چلا آرہا تھا، موسموں کا بدلنا، بیماری، شادی، غمی سب کچھ ہوتا تھا مگر مجھے تو یاد نہیں کہ مستان کی دکان شام کو گجری میں نہ لگی ہو، طاعون کے زمانے میں جب سب لوگ بستی خالی کر دیتے، تب یہ بھی کہیں منتقل ہو جاتا اسی مستان کو سات برس بعد آج گجری میں معمول کی جگہ

دیکھ کر طبیعت خوش ہوئی

میں نے پوچھا: "مستان اگر تم سال میں دو چار دن ناغہ کر دو تو کیا حرج ہے:

کہنے لگا، "سارا دن گھومنے پھرنے کے لیے بہت ہے، گجری میں دو ہی گھنٹے تو بیٹھتا ہوں، اتنی پابندی تو ہونی ہی چاہیے، نہیں تو آدمی بے لگام ہو جاتا ہے، یہ میرے والد کی نصیحت تھی، کہتے تھے میں نے بھی عمر بھر ایسا ہی کیا ہے، پھر گاہک میرے وقت کا اعتبار کر کے یہیں چلے آتے ہیں۔"

اسی بستی میں کتنے نوجوان ہیں جو معمولی کاموں کو عیب سمجھتے ہیں، کھانے پینے کے لیے محتاج اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے ہیں، محنت سے بھاگنے سے اور کیا ملے گا۔!!

رات کا کھانا کھا کر حضور احمد صاحب کے یہاں پہونچا، یہ بستی کے شریف اور دیندار لوگوں میں سے تھے، لیکن خشک مزاج نہیں تھے امیر غریب سب سے میل جول تھا، بھنگی، چمار سے بھی گپ شپ ہوتی رہتی تھی، تحصیلدار کے ہاں سے بھی بلاوا آتا تھا چھوٹی سی معمولی سی ڈیوڑھی میں رہتے تھے اس ڈیوڑھی کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا، کہا کرتے تھے، اگر کوئی مسافر رات کو بستی میں آئے اور اسے سونے کے لیے کہیں جگہ نہ ملے تو وہ یہاں ٹھیر سکتا ہے، اگر کوئی شخص اپنے گھر والوں سے خفا ہو کر کسی رات کو گھر میں نہ سونا چاہے تو یہاں آجاتا ہے، یہ اس کے گھر کے جھگڑے غور سے سُنتے تھے، کام کی باتیں بتلاتے تھے زیادہ تر غریب ہندو مسلمان اپنے گھریلو معاملات میں انھیں سے مشورہ لیتے تھے، جب میں رات کے وقت یہاں پہونچا تو حسب معمول کئی بستر لگے ہوئے تھے، یار لوگ گپ شپ کر رہے تھے، معلوم ہوا کہ لوگوں کی ادلا بدلی ضرور ہے، مگر معمول میں کوئی فرق نہیں ہے، میں بھی وہیں سو گیا، میری سیلانی طبیعت سے والدہ واقف تھیں، اس لیے انھوں نے

کچھ نہ کہا، حضور احمد صاحب کے دروازہ کھلا رکھنے کا اثر مجھ پر اتنا ضرور ہوا کہ کتے بلی کا ڈر میرے دل سے جاتا رہا، مجھے ایسے لوگوں کی صحبت پسند آتی ہے جو اپنے لیے کام کرنے کا ایک طریقہ مقرر کرلیں پھر اس میں فرق نہ آنے دیں

جوں جوں دن گذرتے گئے، ملنے والی کی تعداد بڑھتی گئی، والدہ روزانہ نئے نئے کھانے کھلاتی تھیں، حیدرآباد کی خاص چیزیں مچھلی کا سالن، ثابت بینگن، کھٹی دال، بھیکی دال، بھر مرغ کا سالن، باری باری سے ملنے لگا، حالاں کہ نہ تو میرے پاس دام تھے اور نہ بڑے بھائی کے پاس۔ بھائی صاحب کہنے لگے، مجھے بھی تعجب ہے!! کہ ان پر تکلف کھانوں کا انتظام کیسے کرتی ہیں!

مجھ سے رہا نہ گیا، ایک دن میں نے پوچھا:

"ماں ——— میں تو ہر مہینے صرف پانچ روپے بھیجا کرتا تھا اس میں سے تم نے کھایا کیا اور بچایا کیسے!

ماں کی آنکھوں سے دو چار بوندیں ٹپکیں اور انھوں نے ایسی آواز میں جس میں نہ جانے ملامت کا زیادہ اثر تھا یا محبت کا، کہا:

بیٹا تو اور مجھ سے یہ پوچھے! ایک ایک دن تیرے ہی انتظار میں کٹا ہے، سات برس میں یہ تیاری کر پائی ہوں بیٹا، سات برس میں

ـــــــــ یہی خیال رہتا تھا کہ نہ جانے تو کس حالت میں لوٹتے "

ماں کی اس بات کو سُن کر خاموشی کے فرشتے نے پَر پھیلا دیئے پھر دیر تک کسی نے کسی سے کچھ بات نہ کی

جو لڑکے قصّے کہانیاں پڑھنے کے عادی ہیں، وہ چونکتے ہوں گے کہ ماں سے ملاقات والا قصّہ تو " رقیہ ریحانہ " نے اپنی کہانی "ماں" میں لکھا ہے، یہ اُدھر کی بات اِدھر کیسے آگئی، تو سُنئے آج اس بھید کو بھی کھولنا ہی پڑا، جامعہ میں رخصتوں کی چھان بین کرنے والی کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے میں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ اور رخصتیں چاہے کم کر دی جائیں، لیکن بیماری کی رخصت زیادہ رکھئے، اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ وہ لوگ جو اپنی زندگی کی پروا نہ کرتے ہوئے جامعہ کے کاموں کو مقدم سمجھیں، اگر یہ بیمار ہو جائیں تو اُنھیں اس قانون سے فائدہ ہوگا

ـــــــــ ذاکر صاحب نے فرمایا: " قانون چاہے کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو، لیکن جامعہ اپنے خادموں کو نہ بھولے گی، اس کے لیے قانون کی ضرورت نہیں ہے۔

میں نے کہا: " ڈاکٹر صاحب ہر شخص سے یہ توقع رکھنا کہ وہ قانون سے بے نیاز ہو کر سوچے گا، درست نہیں ہے، مجھے اس موقع پر ماں کا وہ سلوک یاد آگیا، جس کا میں نے اُوپر ذکر کیا ہے، میرے

بے اختیار آنسو ٹپک پڑے، میں نے بھرائی ہوئی آواز میں ڈاکٹر صاحب کو کچھ سمجھانے کی کوشش کی، میرا خیال تھا کہ میں سمجھا نہ سکا، لیکن ذاکر صاحب دل والے آدمی ہیں، وہ سب کچھ سمجھ گئے اور واقعات میں تبدیلی کر کے "ماں" کے نام سے کہانی لکھی اور "رقیہ ریحانہ" کے نام سے چھاپ بھی دی، جب میں سچ مچ کی کہانی لکھنے لگا تو بھلا کہانی کے اس جاندار ٹکڑے کو کیسے چھوڑ دیتا، ذاکر صاحب نے جس زبان میں تم لوگوں کے لیے کہانی لکھی ہے، اسی نہج پر یہ کہانی لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

ہاں تو گھر کی مصیبت کا ذکر ہو رہا تھا، لیکن اپنی مصیبت کا رونا کوئی کب تک روئے، دنیا کے کاروبار چلتے ہی رہتے ہیں، یار دوستوں نے کہا: "ہم نے تو صرف سرکس کی نقل ہی پر قناعت کی۔ جب دلّی سے آئے ہیں تو کوئی ایسا ڈراما ہو جائے، جو کمپنی کو بھی مات کر دے۔" میں نے کمپنیوں کے ایکٹروں کے نقائص بتانا شروع کیے کہ وہ گلے پھاڑ پھاڑ کر بولتے ہیں مُردے کے سامنے گاتے ہیں، سوال و جواب شعروں میں ہوتے ہیں ان کا ہنسی مذاق کا کام بچّوں کو دکھلانے کے لائق نہیں ہوتا، کہنے لگے:

"ہمیں اس بات پر اصرار نہیں ہے کہ کمپنی والوں کا سا کھیل ہو، ہاں ایک شرط ضرور ہے، یعنی ڈراما ایسا ہو کہ لوگ کہیں اتنا اچھا ڈراما ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔" تین مہینے کی چھٹیاں باقی تھیں، میں بھی تیار ہو گیا،

ایک لڑکے کے پاس پُرانا ڈراما "نخزِ عرب" تھا، اس میں بُت پرستی کے نقائص اور ایک خدا کو ماننے کی خوبیاں دکھلائی گئی تھیں، اس ڈرامے کے ساتھ ایک ہنسی مذاق کا قصّہ بھی تھا، یہ دکھانے کے قابل نہیں تھا، اسے نکال دیا، بیکار گانے اور ناچ اُڑا دیئے، ان کی جگہ قوالی رکھی، بعض لمبے منظر چھوٹے کر دیئے اور غیر ضروری گفتگو نکال دی۔ عشق و محبّت کی باتیں اخلاقی رنگ میں تھیں، یعنی ایک میاں اور بیوی خدا کی راہ میں اپنا گھر بار لٹاتے ہیں، اس لیے ان کو بدلنے کی ضرورت نہیں تھی، بیچ میں ایک بات یاد آگئی، جو ڈرامے سے متعلق ہے، سیّد امتیاز علی تاج (۱) نے ریڈیو کے لیے "ناٹک سبھا" کے نام سے بحث کا ایک سلسلہ لکھا ہے جس میں یہ بتایا ہے کہ ڈراما کیوں لکھیں، کس قسم کے ڈرامے کھیلیں، اداکار چُنتے وقت کن کن باتوں کا خیال رکھیں، پھر اس کے دکھانے کے سلسلے میں ضروری باتیں کون کون سی ہیں، امتیاز صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے:

"موجودہ شوقیہ لکھنے والوں کے ڈرامے رُوکھے پھیکے ہوتے ہیں ہمیں پُرانے ڈراموں سے تعصب نہیں برتنا چاہیے، غور کرنے سے اس میں دلچسپی کا مواد بہت ملے گا، اچھے ڈرامے لکھنے کی کوشش تو

---

(۱) جن کے دارالاشاعت پنجاب سے بچّوں کے لیے اچھی اچھی کتابیں چھپتی رہتی ہیں اور رسالہ پھول بھی یہیں سے نکلتا ہے

بے شک ہم جاری رکھیں، لیکن اس عرصہ میں پُرانے ڈراموں سے فائدہ اُٹھائیں، اس طرح کہ ان میں ضروری ردّوبدل کر کے اعتراض کے قابل باتوں کو نکال دیں

یہ بات میرے دل میں بھی تھی لیکن بڑوں کو سمجھانے اور ان کے لیے کچھ لکھنے کا طریقہ نہیں جانتا ہوں، اس لیے چُپ رہا

ہاں تو "فخرِ عرب" ڈرامے کا کام بڑے لڑکوں میں تقسیم کر دیا گیا، دن کا کاروبار ختم کرنے کے بعد لوگ ایک احاطہ میں جمع ہو جاتے تھے، جب تک "پارٹ" یاد نہ ہو، سکھانے کا لُطف نہیں آتا ہے اس لیے پہلے پہل معاملہ یوں ہی رہا ——— پھر اداکاری دکھانے سے لوگ شرماتے تھے، بس میرا کام دیکھ کر ہنستے تھے اور لطف اٹھاتے تھے، میں نے کہا ——— "جناب اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں روزانہ تماشا دکھایا کروں اور آپ لوگ بیڑیاں پیتے ہوئے میرے کام کی داد دیں، میں جھوٹ موٹ خفا ہو کر جانے لگا، لوگوں نے خوشامد کی اور "پارٹ" یاد کرنے کا وعدہ کیا، میں نے اس عرصے میں ایک دو لڑکوں کو "پارٹ" یاد کرا کے اچھی مشق کروائی، جب دوسرے دن سب لوگ جمع ہوئے تو ان لڑکوں کا کام دیکھ کر سب کو جوش آیا اور ہر شخص اداکاری کے جوش میں دھینگا مشتی کرنے لگا۔ ایک بات اور یہ بتا دوں

کہ کام کرنے والوں میں کچھ تو مدرسے کے بڑے لڑکے تھے، کچھ میرے ساتھی، جو اب کاروبار کرنے لگے ہیں، اور بعض ادھیڑ عمر کے لوگ جہاں میں "لڑکوں" کا لفظ استعمال کروں، اس سے تینوں قسم کے لڑکے مراد ہیں)
ڈراما عام لوگوں کو دکھایا جانے والا تھا، گانے بجانے کا انتظام بھی تھا، طبلہ اور ہارمونیم بجانے والے ایک چھوٹو کئی تھے، ساز کا شوق رکھنے والے تماشے دیکھتے رہتے ہیں، انھیں کام دکھانے کا موقع مل گیا تھا، ان باجوں کی وجہ سے ابتدائی مشق کی کوفت جاتی رہی تھی، جوں جوں دن گذرنے لگے، لڑکوں کا کام بہتر ہوتا گیا، تماشہ کھلے میدان میں دکھایا جانے والا تھا، لیکن وہاں بہت بڑا ٹیلا تھا، جس کو ہموار کرنے کی ضرورت تھی، تم جانو ڈراما محض اداکاروں سے ہوتا نہیں ہے، پھر عام لوگوں کو دکھائے جانے والے ڈرامے میں تو بیسیوں بڑی عمر کے کام کرنے والوں کی ضرورت ہوتی ہے، چندہ جمع کرنا، روشنی کے لئے ہنڈے، منڈوے کے لیے بلّیاں، ٹین فراہم کرنا، بڑے بڑے پردوں کا لگانا، بیٹھنے کا انتظام، لوگوں کو قابو میں رکھنے کے لیے جگہ جگہ رضا کاروں کا پہرہ، میری رائے ہوئی کہ مشق اسی میدان میں ٹیلے کے پاس ہو تاکہ بڑی عمر کے وہ فالتو لوگ جو رات کے نو بجے سے لے کر بارہ بجے تک بیڑیاں پھونکتے ہوئے مشق دیکھتے ہیں، اس ٹیلے کو ہموار کرنے کا کام کر ڈالیں، سب

لوگوں کو شوق ہوگیا تھا، پٹیل پٹواری، دکان دار، کسان، سب ہی دلچسپی
لے رہے تھے، مشق وہیں ہونے لگی، تین چار راتوں میں ٹیلے کے بجائے
بہترین اسٹیج تیار ہوگیا، کسانوں کے یہاں سے بلیاں اور رسیاں مانگ کر
منڈوا بنایا گیا، میں اس بات کو اچھی طرح جانتا تھا کہ جوں جوں کام بہتر
ہوتا جائے گا، لوگوں کی دلچسپی بڑھتی جائے گی، حتیٰ کہ کام کرنے والوں
کی تعداد ضرورت سے زیادہ ہو جائے گی، ہر شخص یہی کہتا تھا جو مدد چاہیے
ہم سے لے لیجیے؛ کسانوں نے منڈوے کا سامان دیا، غریبوں نے
منڈوا سجایا، بانس گئے، رنگین کاغذوں کے محل اور جیل خانے کے
مناظر تیار کئے گئے، ایسے مناظر کہ محض انھیں دیکھ کر تالیاں بجتیں
کمشنر ضلع سے اجازت لی گئی، کھیل کا اعلان ہوا بستی کے لوگ ہنڈوں
کی روشنی میں جوق در جوق جمع ہونے لگے، سارا میدان بھر گیا، تعداد
ہزاروں تک پہونچ گئی، اتفاق کی بات کہ اسی دن کوئی چار بجے سے
میرے پیٹ میں اچانک سخت درد اٹھا، ایسا درد کہ تڑپ تڑپ جاتا
تھا، سب اداکار گھبرائے تھے، میرے گھر سے منڈوے تک خبروں کا
سلسلہ بندھ گیا، میں ہر تھوڑی دیر میں یہی کہتا: " اعلان ہو چکا ہے دیہاتوں
سے لوگ چل پڑے ہوں گے، ہزاروں کو مایوسی ہوگی، میری وجہ سے کھیل
بند نہ کیا جائے، اس کا انتظام پہلے ہی سے کر لیا تھا کہ ضرورت پڑے تو

میری عدم موجودگی میں فلاں شخص رہنمائی کرے گا، اس بات کو جانچنے کے لیے مشق کے وقت الگ تھلگ ہو جایا کرتا تھا، خیال تھا کہ آج کا ڈراما میرے بغیر ہی کرنا پڑے گا، مگر اللہ میاں نے انسان میں عجیب وغریب طاقتیں رکھی ہیں، بعض دفعہ انسان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہوا، اور کیوں کر ہوا، تو سُنئے کہ کچھ لوگوں نے یہ خبر عام لوگوں میں پھیلا دی کہ اس ڈرامے میں ہندوؤں کی برائی ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔۔۔۔ کی گئی ہے، اور اس کی وجہ سے ہندو مسلمانوں میں فساد ہو جانے کا اندیشہ ہے، کھیل شروع ہونے میں صرف آدھا گھنٹہ رہ گیا تھا، میں درد کی حالت میں اپنے مکان پر تھا، گھر کے سب لوگوں کو تماشہ دیکھنے کے لیے بھیج دیا تھا، صرف ماں میرے پاس رہ گئی تھیں جوں ہی یہ منحوس خبر میرے کانوں میں پہونچی، خیال آیا " کیا آج تماشہ نہیں ہوگا اور ہوگا تو بلوہ ہو جائے گا! میں ایک دم چارپائی سے اُٹھ بیٹھا اور چادر اوڑھے ہوئے باہر نکلنے لگا، ماں نے مجھے پکڑ لیا، میں نے انھیں دھکا دیتے ہوئے کہا:

"ماں آپ نہیں جانتیں آج بلوہ ہو جائے گا ——— مجھے جانے دیجئے" یہ لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا پھاڑتا اسٹیج پر پہونچا، ہزاروں تماشائی میدان میں چھائے ہوئے تھے، تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی بستی کے پڑھے لکھے اور بے پڑھے، سب ہی لوگ تھے، پہلے

پردے کے سامنے کھڑا ہوگیا، لوگوں نے دیر تک تالیاں بجائیں، شاید بعضوں کو یہ خیال بھی ہوا ہو کہ افواہ سُن کر تماشہ کو بند کرنے کا اعلان کرنے کے لیے سامنے آیا ہے، میں نے کہنا شروع کیا :

"حضرات !

یہ خبر پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ آج کے ڈرامے میں ہندؤوں کی مذمت ...... کی گئی ہے، یہ غلط ہے، اوّل تو اس تماشے کی کہانی، سمندر پار کے عربوں اور رومیوں کے بارے میں ہے، چنانچہ کام کرنے والوں کو آپ اسی لباس میں دیکھیں گے، ہندؤوں کا اس ڈرامے میں کہیں ذکر نہیں ہے رہی یہ بات کہ اس میں ایک خدا کو ماننے کی تعریف کی گئی ہے تو یہ صرف مسلمانوں ہی کا عقیدہ نہیں، خود ہندؤوں میں پڑھے لکھے لوگ اس کے قائل ہیں، اس میں لڑائی کی کیا بات ہے پھر ہماری بستی میں سارے کام ہندو مسلمان مل کر کرتے ہیں، طبلہ بجانے والا کون ہے، تکا رام، بالیاں کس نے دیں دھکل بھائی اور بوشٹی نے، ہنمنت راؤ وکیل نے جو اس قدر کٹر سناتنی ہیں اپنا ہارمونیم دیا ہے، سوچنے کی بات ہے کہ اگر جھگڑے کی چیز ہوتی تو یہ لوگ پہلے ہی سے الگ ہو جاتے۔"

سُنا ہے، میں نے آدھے گھنٹے تک تقریر کی، لوگ اس طرح چُپ چاپ سُنتے رہے، جس طرح مدرسے کے لڑکے اُستاد کی بات سُنتے ہیں، اس زمانے میں ریاستوں میں نعرے لگانے کا قاعدہ نہیں تھا ورنہ لوگ "انقلاب زندہ باد" "غفّار صاحب زندہ باد" کے نعرے ضرور لگاتے، بچارے تالی بجاکر چُپ رہے، مجھے یاد نہیں کہ میں نے اس تقریر میں اور کیا کیا کہا: "ہاں اتنا یاد ہے کہ پیٹ کا درد غائب ہوگیا تھا، وہی پیٹ کا درد جس سے میری جان نکلی جاتی تھی، رات کے تین بجے تک کھڑے ہوکر ڈراما کروایا، آخر میں بستی کے معزز لوگوں کی طرف سے انعامات کا اعلان ہوا

لوگ جو ڈرامے کے کام کو اخلاقی حیثیت سے گِرا ہوا اور اس میں حصّہ لینا عیب سمجھتے تھے، یہ ساری روداد سُن کر کہنے لگے:

"ہمارا خیال تھا کہ لڑکے ایک جگہ جمع ہوکر اُلٹے سیدھے گانے گائیں گے، آدھی رات تک جاگنے سے صحت خراب ہوگی اپنے کاروبار سے جی چرائیں گے، پھر عشق و محبّت کی باتیں گلی گلی سنائی دیں گی، آپ نے اس کا خیال رکھا کہ ان میں سے کوئی بات نہ ہونے پائے، سُنا ہے کہ رات کو سب لوگ تماشے کے قائل ہوگئے"۔

" مصطفیٰ کمال پاشا کے ڈرامے میں تو صرف تاریخی باتیں ہیں، جب

اس قدر محنت سے منڈوا سجایا ہے تو دوسرا ڈراما کھیلنے میں سہولت رہے گی، گرمیوں کے دن ہیں اسٹیج خراب نہ ہوگا، آپ ہماری خاطر اس دوسرے ڈرامے کو بھی دکھلا دیجئے۔

مجھے ڈرامے کے "پلیٹ فارم" پر سب لوگوں کو متحد کرنا، اور اس کی اخلاقی حیثیت کو اونچا کرنا تھا، اس سے بہتر موقع اور کیا ملتا، میں راضی ہو گیا، اس تماشے کے دیکھنے میں تھانے کے ایس (سب انسپکٹر) صدر مدرس مع عملہ، مقامی ڈاکٹر وکلا سبھی لوگ موجود تھے، تحصیلدار صاحب کہتے تھے کہ میں بھی اپنے بنگلے پر سُن رہا، بچوں کی ایک فوج بھی تیار کرائی تھی، ان کی لڑائی بہت پسند کی گئی، لوگ اسٹیج کے آداب سے واقف نہیں تھے، ایک صاحب تو اسٹیج پر چلے گئے اور اس ننھی سی فوج کے کمانڈر کو انعام میں پانچ پانچ روپے کے دو نوٹ دیئے کہ سب مل کر مٹھائی کھائیں۔

بستی میں بے روزگاری پھیلی ہوئی تھی بعض دوستوں کی رائے ہوئی کہ میں ایک کمپنی قائم کر دوں، میں نے انھیں سمجھایا کہ مجھے جامعہ میں کام کرنے کا بہت موقع ہے، وہاں پڑھانے کا آزمائشی کام کیا ہے، جامعہ والوں نے موگا بھجوایا ہے، وہاں کے لڑکے بھی ڈرامے کے شوقین ہیں، اس لیے مجھے تو وہیں کام کرنا ہے، ایک جاننے والے

دوست نے کہا: "غالباً آپ کو اس روپے کا خیال ہے، جو جامعہ نے موگا کی تعلیم پر خرچ کیا ہے، اس کی تو فکر نہ کیجیے، چند کھیلوں میں یہ رقم نکل آئے گی، بلکہ ہم جامعہ کی ماہوار امداد مقرر کر دیں گے، آج کل "بالکنڈہ کمپنی جس کے کھیلوں کا ہمارے کھیلوں سے کوئی مقابلہ نہیں ہے، ضلع کے لوگوں کو لوٹ رہی ہے، مانا کہ ہمارے کھیلوں میں بازاری عورتیں، ناچ گھٹیا مذاق نہیں ہیں، لیکن اس سے تو ہمارے کھیلوں کی قدر بڑھ جائے گی، ہر جگہ پڑھے لکھے لوگ ہمارا استقبال کریں گے!"

"مہربان من! یہ صحیح ہے کہ اگر کمپنی قائم کی تو انشاء اللہ خاص بلدہ کے (یعنی شہر حیدرآباد کے) پڑھے لکھے لوگوں کو بھی قائل کر دیں گے لیکن سوال تو جامعہ سے علیحدگی کا ہے، وہاں ایسے لوگ کام کرتے ہیں، جنہوں نے قول دے رکھا ہے کہ مرتے دم تک کام کریں گے اور ڈیڑھ سو روپے ماہوار سے زیادہ نہ لیں گے، جی نہیں چاہتا کہ ایسے لوگوں کا ساتھ چھوڑ دوں، پھر ایک بات میرے دل میں اتر گئی ہے کہ لڑکے سارے کام کر سکتے ہیں، میں نے موگا میں بھی، یہی بات سیکھی ہے، میں لڑکوں کو پڑھانے میں خوش رہوں گا، تم جانو کسی کو "سچا شوق" ہو جائے تو پھر اسے پورا کرنے کے لیے طرح طرح کے راستے ڈھونڈھتا ہے، ایک نہ سہی دوسرا سہی"، کچھ لوگوں نے کہا کہ آپ کی چھٹی ختم ہونے

میں ایک مہینہ باقی ہے، ایک کھیل اور دکھا دیجیے، اور مدہ چل سے باہر کسی مقام پر تین کھیل دکھا کر آپ جامعہ چلے جائیے، ہم خود دو ایک کھیل تیار کر لیں گے، اتنے میں آپ دلی سے کوئی ڈائرکٹر بھجوا دیجیے میرے ذہن میں فوراً فیاض حسین صاحب لوقان' رسالۂ ہونہار کے مدیر کا خیال آیا، یہ حضرت بھی بڑے من چلے ہیں، ڈراموں سے دل چسپی ہے حیدرآباد کی مقامی کمپنیوں کے ڈائرکٹروں سے تو کہیں اچھے ہیں، جامعہ کے طالب علمی کے زمانہ میں عبدالواحد صاحب کی طرح ان کے ساتھ بھی یہ طے پایا تھا کہ کوئی اور اچھا کام نہ ملا تو کمپنی ضرور قائم کریں گے، نوکری سے انھیں دل چسپی نہیں ہے، کتابت جانتے ہیں، لیکن اس کام سے لگاؤ نہیں ہے، جامعہ سے ایف اے پاس کرنے کے بعد رسالہ ہونہار نکالنے لگے، مجھ سے کئی دفعہ کہا تھا کہ کسی ایسے کام کا مشورہ دوں جس کے کرنے میں رسالہ ہونہار کا کام بھی جاری رہے

میں نے خیال کیا اس کمپنی کا کام ان کے لیے اچھا رہے گا، جیبوں کے ذریعے جب بہت سارا روپیہ جمع ہو جائے تو اس فن کے بہترین لوگ یعنی ڈراما لکھنے والے، اسٹیج سجانے والے، تماشے تیار کرنے والے ڈائرکٹر، ملازم رکھ لیے جائیں گے، فیاض صاحب کا تجربہ اور بڑھ جائے گا، اس خیال کا آنا تھا کہ میں نے رضامندی ظاہر کر دی، اب ایک بڑی

مشکل یہ تھی کہ اس شوق میں حصہ لینے والے تین چوتھائی لوگوں کو تو کسی کا ڈر نہیں تھا، لیکن ایک چوتھائی ساتھیوں کو اندیشے ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ یہ بات ان کے سرپرستوں کو معلوم ہوگی تو وہ سخت مخالفت کریں گے، اور کمپنی کے قائم ہونے میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالیں گے، اگر ان کے بجائے اور لوگوں کو لیتے ہیں تو انھیں پچھلے دو کھیل یاد نہیں ہیں میری موجودگی میں اس کام کا شروع ہو جانا ضروری تھا، بہت سوں کو یقین تھا کہ وقت آنے پر یہ جامعہ کی طرف چل کھڑا ہوگا، جن لوگوں کے سرپرستوں کی طرف سے اندیشہ تھا، انہوں نے کہہ رکھا تھا کہ ہمارے بجائے اور لوگوں کو ہرگز نہ لینا، ہم کسی کے روکنے سے رُکنے والے نہیں، چاہے ہماری جان چلی جائے، غرض کہ ایسی ایسی کئی اُلجھنیں تھیں

میں نے کہا آپ لوگ گھبرائیے نہیں، جیسا میں نے کہا ہے تمام تیّاریاں خفیہ طور پر کیجیے، عہد کیجیے کہ ہم اس کا ذکر زبان پر نہ لائیں گے مجھ سے زیادہ میرے ساتھیوں کو کمپنی بنانے کا شوق تھا، بھلا وہ ان ہدایتوں پر عمل کیسے نہ کرتے، طے پایا کہ پندرہ دن کے بعد چل پڑیں گے اس عرصہ میں ایک ساہوکار کو حصّہ دار بنا کر ابتدائی رقم خرچ کرنے کے لیے تیار کیا گیا، سات آدمیوں کی انجمن بنی، جو کمپنی قائم کرنے اور اس کے

چلانے کی ذمہ دار تھی، ان میں سے ایک ساہوکار تھا، باقی چھ اداکار تھے اور لوگوں کو ملازم رکھا گیا۔ یہ طے تھا کہ جب کمپنی کا کام چل پڑے تو تنخواہوں میں معقول اضافہ ہو جائے گا۔ ضلع میں جا کر اشتہارات اور ٹکٹ چھپوانے تھے مطبع والے پوچھتے تھے: "یہ کمپنی ضلع میں بھی آئے گی یا نہیں۔" کہا گیا کہ قائم ہی اسی لیے ہوئی ہے، ایک اور ساتھی نے "دی نیشنل تھیٹریکل کمپنی آف حیدر آباد دکن" کے منیجر کی حیثیت سے ایک مہینے کے کھیلوں کی اجازت لے لی، جگہ کے انتخاب میں اس بات کا خیال رکھنا تھا کہ ریلوے اسٹیشن نہ ہو، تاکہ اس کی خبر فوراً عام نہ ہو جائے، شہر سے کافی دور جنگل کے علاقے میں ایک مقام نرمل تھا، یہاں کے لوگ کافی خوشحال ہیں، چھوٹی چھوٹی کمپنیاں یہاں سے کافی رقم لے جاتی ہیں، تین دن پہلے ایک معتبر آدمی کو بھیج دیا کہ وہ ہم لوگوں کے ٹھہرنے اور اسٹیج کے لیے جگہ کا انتظام کرے، تاریخ مقررہ پر رات کے بارہ بجے تین لاریاں بستی سے باہر کھڑی تھیں، چپ چاپ سامان لادا اور خدا کا نام لے کر ہم لوگ چل پڑے، اندھیری رات تھی، راہ گیروں کا آنا جانا بند ہو گیا تھا، یہ میرا دوسرا خفیہ سفر تھا، لیکن اس دفعہ میں تنہا نہیں تھا بلکہ میرے ساتھ پچاس کے قریب تھے، شریف لوگوں کی جماعت تھی، یہ سب تہیہ کر چکے تھے کہ ہم ساری مشکلوں کا مقابلہ کریں گے، خیال تھا کہ صبح

اُٹھتے ہی بستی والوں میں کھلبلی مچ جائے گی کہ پچاس آدمی غائب ہیں، غالباً صبح ہی سے تلاش شروع ہو جاتی، لیکن ہم نے ہوشیاری یہ کی تھی کہ جس سرپرست کی طرف سے سب سے زیادہ اندیشہ تھا، ان کے آدمی کو وہیں چھوڑ آئے تھے کہ وہ کھیل سے چند گھنٹے پیشتر ہمارے پاس پہونچ جائے۔ میں سوچتا تھا کہ میرے متعلق لوگ کیا کہیں گے ——— لیکن یہ اطمینان تھا کہ میرے ساتھ ان لوگوں کی جماعت تھی ——— جو بے روزگاری کی وجہ سے پریشان تھے، ان میں سے بعض کے کھیت اور گھر بستی کے "شریف، لوگوں" نے چند ٹکوں میں رہن رکھ لئے تھے، یا ان پر قبضہ جما لیا تھا، مجھے بستی کے اور بھی "شریف، لوگوں" کا حال معلوم تھا، جو سفید لباس میں مہذب طریقے سے لوگوں کو لوٹ رہے تھے، میں اور بدعنوانیوں سے بھی واقف تھا جو بستی میں ہو رہی تھیں، اگر کمپنی قائم کرنا عیب بھی ہو تو مجھے یقین تھا، کہ ان عیبوں کے مقابلے میں بہت غنیمت ہے، اگر تماشہ کرنا برا ہے تو "شریف لوگ" تماشہ دیکھتے کیوں ہیں، نہ معلوم ساتھیوں کے دل میں کیا کیا خیالات آ رہے تھے، وہاں سے صبح صبح ندی کے کنارے پہونچ گئیں، ناشتہ کر کے روانہ ہوئے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برات جا رہی ہے، شہر نزدیک وہاں سے قریب تھا، تھوڑی دیر میں جا پہونچے

"آپ لوگ غلط وقت پر آئے، آس پاس کے گاؤں میں ہیضہ ہے

اور یہاں بھی افواہیں پھیل رہی ہیں" بستی کے ایک شخص نے کہا
میں نے دل میں کہا: "انا للہ وانا الیہ راجعون" ایسے موقعوں پر بدحواس
ہونے سے معاملہ اور بھی خراب ہوتا ہے، جس شخص کو پہلے سے بھیجا گیا تھا
یہ اس کی غلطی ہے کہ اس نے ہمیں اطلاع نہ دی، لیکن وہ چپکے سے کہنے لگا
"غفار صاحب خفا نہ ہوں، اللہ بہتر جانتا ہے، یہی خیال تھا کہ
اگر میں نے وبا کی اطلاع دی تو یقینی بات ہے کہ کمپنی باہر نہ نکل سکے گی"
ساتھی پر غصہ ضرور آیا مگر "شوق" جانتا تھا کہ شوق آدمی کو اندھا بھی
کر دیتا ہے۔

میں نے کہا: "کم بخت! اب اس کام کو نپٹانا بھی تو ہے، میرے
ساتھ چلو" ہم دونوں تلنگی کمپنی کے منیجر کے پاس پہونچے، یہ کمپنی کافی روپیہ
کما کر ہیضہ کی افواہوں کی وجہ سے واپس جا رہی تھی (ساتھی کی ایک غلطی یہ
بھی تھی، کہ اس نے اس کمپنی کی موجودگی کی اطلاع نہ دی) ایسے موقعوں پر
کمپنی کے آ جانے سے دونوں کو گھاٹا رہتا ہے) اسٹیج لگا لگایا تھا، منیجر
بڑی مشکل سے بیس روپے فی کھیل کے حساب سے ہمیں تین کھیلوں کے
لیے اسٹیج کرائے پر دینے کو تیار ہوا، دوسرے دن کے لیے کھیل کا اعلان
ہو گیا، صبح ہوتی، کھیل کی تیاریاں ہونے لگیں، اس ساتھی کا انتظار تھا، جسے
چھوڑ آئے تھے، یہ بہترین اداکاروں میں سے تھا، خفیہ خبر رسانی کے لیے چند

آدمی لگا رکھے تھے، اتنے میں خبر آئی کہ اس اداکار کو کوٹھری میں بند کر دیا گیا ہے
اب کیا ہو ـــــ تماشہ کا اعلان تو ہو چکا ـــــ تین دن میں پچاس آدمیوں کے
کھانے پر کافی رقم خرچ ہو رہی تھی ـــــ میرے ساتھی پریشان تھے، میں نے
کہا، گھبرانے کی ضرورت نہیں، شام تک اسی پارٹ (کام) کو میں یاد کر لوں
گا اور آج کے کھیل میں اداکار بنوں گا، سکھانے میں بہت سارے جملے
یاد ہو گئے تھے، شام تک یاد کرتا رہا، کھیل ساڑھے نو بجے شروع ہونے والا
تھا، ٹکٹ گھر پر باجا بج رہا تھا۔ ہیضہ سے مرے ہوئے ایک آدمی کی میت
اسی راستے سے گذری، شہر ہو تو پتہ نہ چلے مگر قصبہ میں یہ بات دم بھر میں
مشہور ہو گئی، محلے میں خوف و ہراس پھیلنے لگا اور دروازے بند ہونے شروع
ہوئے، جو لوگ چل پڑے تھے، انھوں نے ٹکٹ خرید لیے، ہر درجے میں
کچھ نہ کچھ لوگ نظر آتے تھے، میں نہ جانے کن خیالات میں ٹہل رہا تھا، باجے
کی آواز بے روح معلوم ہوتی تھی ـــــ "آج بستی والوں کے لیے خوشی کا
دن ہوتا، ٹکٹ گھر پر لوگوں کی بھیڑ ہوتی، ہال کھچا کھچ بھرا ہوا نظر آتا، لوگ
دوسرے کھیل کے انتظار میں رہتے، مگر حادثات پر کون قابو پا سکتا ہے، اگر
قابو پائے تو زندگی میں اُتار چڑھاؤ نہ ہو، اور اس کے بغیر زندگی کی کہانی بے مزہ
رہے، ساڑھے نو بجے ساتھیوں نے کہا، لوگوں کا کچھ اور انتظار کریں، مگر میں نے
سیٹی بجا دی اور پٹاخے کی آواز کے ساتھ تماشہ شروع ہوا، میں لقمہ دینے

والے کی مدد سے اپنا کام نبھاتا گیا، بعض حرکتوں سے لوگ محظوظ (خوش) ہوئے، لیکن یہ حرکتیں پارٹ بھولنے کی وجہ سے کرتا تھا، دھیان دینے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا کہ میں یہ کیا کر رہا ہوں، سوال و جواب کا سلسلہ بندھا ہوا تھا — صحیح حساب لگایا تو ساٹھ روپے کی آمدنی ہوئی، بیس روپے اسٹیج والے کو دیئے اور چالیس روپے کمپنی کے محاسب نے رکھ لیے، ہر شخص یہی کہتا تھا کہ ہیضہ شروع نہ ہوتا تو پہلا کھیل ڈھائی سو سے اوپر کا تھا، خیال تھا کہ اگر کسی نے ٹھیکہ لیا تو ہم ڈھائی سو سے کم کی بات نہیں کریں گے، ایک دن بیچ کر کے کھیلنے کا ارادہ تھا تاکہ اداکاروں کو آرام ملے، مگر ہیضہ سے موتیں ہونے لگیں، مدرسے بند ہو گئے، بازاروں میں رونق نہ رہی، تھانے کے اے ایس آئی (سب انسپکٹر) نے اطلاع دی کہ اب تماشے دکھانے کی اجازت نہیں ہے، اگر وہ منع نہ بھی کرتے تو میں خود کھیل نہ ہونے دیتا۔

کسی دوسری جگہ جانے کا سوال ہی نہ تھا، وبا کا نام بُرا ہوتا ہے سب کہیں یہی مشکلیں پیش آئیں، مدہول والوں کو ان حالات کی اطلاع ہو چکی تھی ان کا اصرار تھا کہ ہم فوراً واپس ہو جائیں، غرض یہی طے ہوا کہ کمپنی کا کام اس وقت ملتوی رکھا جائے، ہم سب مزید پریشانی اٹھائے بغیر گھر پہنچ گئے۔

جامعہ کھلنے والی تھی، میں دہلی چلا آیا

شمالی ہند کا دوسرا سفر

شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کو علم ہو گیا تھا کہ میں کسی کمپنی کے چکر میں پھنس گیا ہوں، لیکن انھیں یقین تھا کہ لوٹوں گا ضرور، جب دہلی پہونچا تو انھیں اطمینان ہوا اور فرمانے لگے:

"میں نے ایک کام ایسا سوچ رکھا ہے جو آپ کی طبیعت کے مناسب ہے، جسے آپ رفتہ رفتہ بہتر بنا سکتے ہیں، پہلی چار جماعتیں (ابتدائی اول سے چہارم تک) آپ کے سپرد کرتا ہوں، چھوٹی سی نئی عمارت جو بن رہی ہے، اس میں چند کمرے تیار ہیں، اپنا کام وہیں شروع کیجیے، جن جن لوگوں اور چیزوں کی ضرورت ہوگی وہ آپ بتائیں گے اور میں انتظام کروں گا۔"

اگرچہ پچھلے ساڑھے تین مہینے رات دن جاگ کر ایک کر دیئے تھے چند راتیں بھی آرام سے سونے کے لیے نہیں ملی تھیں، لیکن مجھے یہ احساس ہی نہ ہوتا تھا کہ میں تھکا ماندہ ہوں، نہ جانے یہ طاقت کہاں سے آگئی تھی، خدا کا نام لے کر جب اس نئے کام کو شروع کیا تو اپنے آپ کو پہلے سے بھی زیادہ طاقتور محسوس کرتا تھا، غالباً اس نئے کام کے شوق نے میری ہمت میں اضافہ کر دیا تھا، یہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ سچے دل سے
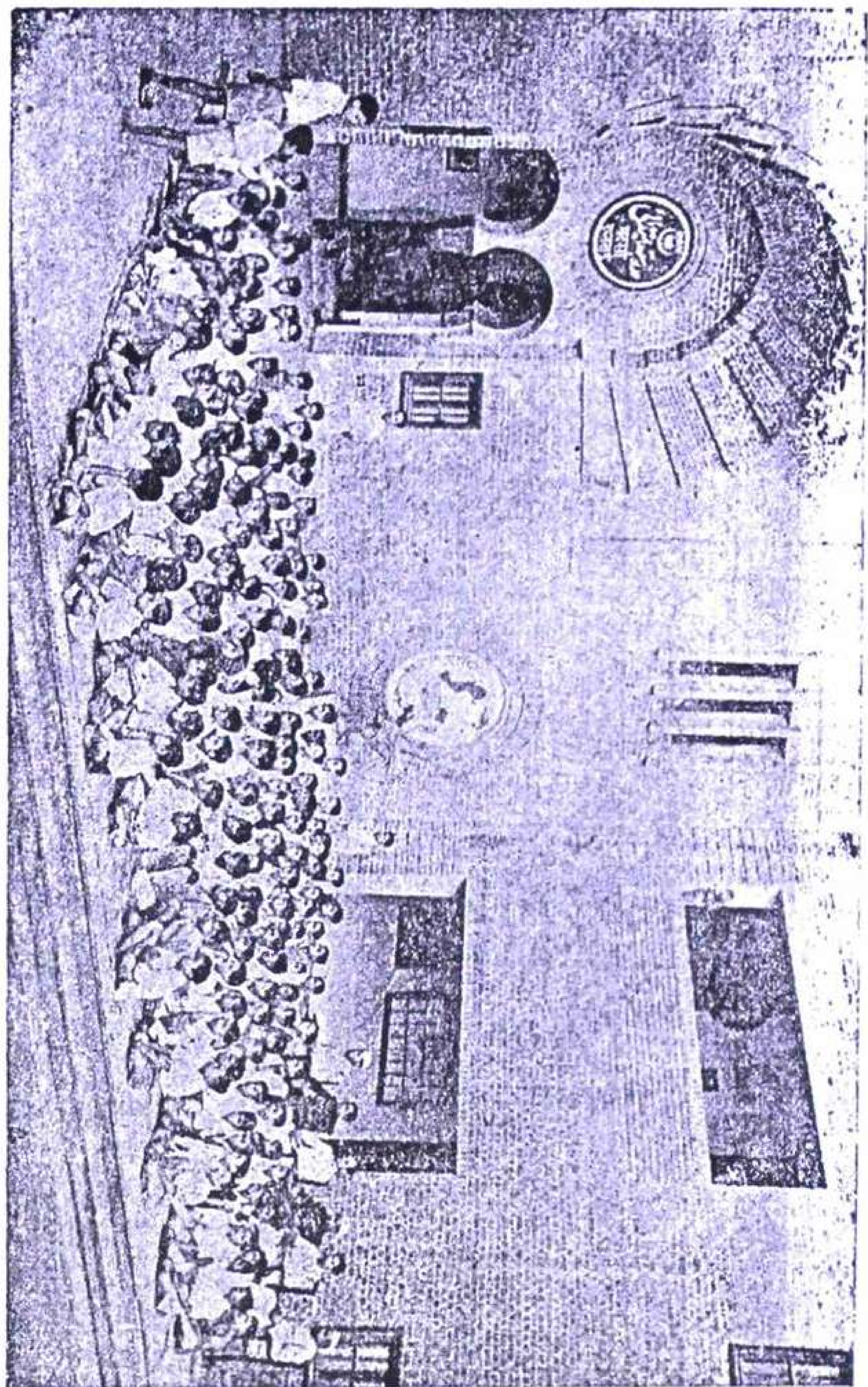
کوشش کرنے والوں کی ضرور مدد کرتا ہے۔ بعد میں اگلی دو جماعتوں کا اضافہ ہوا۔
میں نے اس مدرسہ کو اپنے ساتھیوں کی مدد سے چند سال میں مثالی مدرسہ
بنا دیا تھا۔ کسے معلوم تھا کہ جن ہیڈ ماسٹر صاحب کے یہاں میں نے باورچی کا کام
کیا ہے ایک دن اُن کی جگہ ہیڈ ماسٹر ہو جاؤں گا۔

مدرسہ کے کاموں کے علاوہ مطبخ کی نظامت کے فرائض بھی انجام دیئے۔
دعوتی کھانوں کے ذائقہ کو چکھتے وقت طالب علمی کے زمانے کی دال روٹی یاد آتی تھی۔

کچھ عرصہ کے لئے جامعہ میں خازن کی حیثیت سے بلوں اور تنخواہوں کے
گوشواروں پر دستخط کرتے وقت اپنی ۸ روپئے ماہوار کی تنخواہ کا خیال آتا تھا۔

۱۹۴۶ء میں جامعہ کی جشن جوبلی کی نظامت میرے سپرد ہوئی تھی۔ کسے معلوم
تھا کہ ۱۹۲۳ء میں داخلے سے مایوس طالب علم کو ۲۱ برس بعد یہ اہم ذمہ داری سپرد کی جائے گی۔

اس کہانی کو ایک واقعہ پر ختم کرنا چاہتا ہوں، جسے اس کا نچوڑ سمجھنا چاہیئے۔
اس عرصہ میں خواجہ عبدالمجید صاحب جو پہلے شیخ الجامعہ تھے امیر جامعہ ہو گئے
تھے۔ جب جامعہ نگر میں تاسیس کا جلسہ ہوا اور موصوف پہلی دفعہ یہاں تشریف
لائے تھے جامعہ کی طرف سے خواجہ صاحب کو خوش آمدید کرتے ہوئے میں نے ایک
ایڈریس پڑھا تھا جس میں چھوٹے بچوں کی تعلیم کے نئے نئے طریقوں اور طرح طرح کے
مشغلوں کا ذکر کیا جو مدرسہ میں رائج کئے گئے تھے اور جن سے بچوں میں عمل کی صلاحیت پیدا
ہوتی ہے، ان میں [illegible]، سوجھ بوجھ، اپج، اُمنگ، دین داری، دیانت داری

اور ذمہ داری بھی پیدا ہوتی ہے، آخر میں، میں نے کہا کہ اب جامعہ کے مدرسے کی شہرت اور قدر اتنی بڑھ گئی ہے کہ بچوں کے داخلے کی بے شمار درخواستیں آتی ہیں، جن میں سے بہت سی، ہمیں عمارت اور سامان کی کمی کی وجہ سے نامنظور کرنی پڑتی ہیں، اور یہ درخواست کی کہ خواجہ صاحب اور دوسرے قومی رہنما جامعہ کے لیے وسائل فراہم کریں تاکہ ہم لوگ اپنا کام یکسوئی اور اطمینان سے کرسکیں۔

میں ایڈریس پڑھ رہا تھا اور مجھے رہ رہ کر خیال آرہا تھا کہ خدا کی قدرت ہے۔ پہلے ۱۹۲۳ء میں ایک وہ دن تھا کہ خواجہ صاحب شیخ الجامعہ تھے، جن کے سامنے میری آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری تھیں، میں وظیفہ کے لیے جتنی عاجزی سے التجا کرتا تھا یہ اتنے ہی بے توجہ ہوتے تھے، یہاں تک کہ میں، ان کے گھر پر جاکر بیگم صاحبہ کے سامنے اپنی مصیبت کا رونا رویا اور آخر میں مجھ سے پیچھا چھڑانے کے لیے انہوں نے مجھے آٹھ روپے ماہوار پر جامعہ کے چھاپہ خانے میں مزدور کی حیثیت سے رکھوا دیا، اور ایک آج کا دن ہے کہ میں جامعہ والوں کی طرف[1] سے بھرے مجمع میں ان سے مخاطب ہوں اور یہ امیر جامعہ کی حیثیت سے میری باتوں کو بڑے غور سے سن رہے ہیں۔

---

(۱) میرے بعد مدرسے کے نگراں اکبر علی صاحب ہوئے لیکن ذمہ داری کے کاموں میں میں بھی شریک تھا اس طرح میں نے تیس ۳۰ برس تک مدرسہ ابتدائی میں کام کیا اس کے بعد میں استادوں کے مدرسہ میں منتقل ہو گیا

ISBN : 978-81-7587-662-0

₹ 54/-